کورس کوڈ: 6596

سطح : بی ایس

بلوچ: تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب

Baloch: Civilization, Culture and Language & Literature



شعبہ پاکستانی زبانیں

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مطالعاتی رہنما

برائے بی ایس پروگرام

بلوچ: تہذیب، ثقافت اور زبان وادب

کورس کوڈ:6596 یونٹ 1 تا 9

شعبہ پاکستانی زبانیں

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

ایڈیشن:	اول
اشاعت اول:	2024ء
تعداد اشاعت:	1000
کمپوزر:	امتنان اقبال
لے آوٹ:	حدیقہ فاطمہ
نگران طباعت:	ڈاکٹر سرمد اقبال
پرنٹرز:	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
پبلشر:	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

کورس ٹیم

چیئرمین: پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

ادارہ تحریر: ڈاکٹر واحد بخش بزدار
ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بلوچ
ڈاکٹر رحیم بخش مہر
محمد پناہ بلوچ

نظر ثانی: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بلوچ

فاصلاتی تشکیل: پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
ڈاکٹر عبدالواجد تبسم
ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بلوچ
ڈاکٹر حاکم علی برڑو
ڈاکٹر زیب النساء

کورس رابطہ کار: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بلوچ

فہرست

پیش لفظ:	پروفیسر ڈاکٹر ناصر محمود (وائس چانسلر)	05
دیباچہ:	پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد (چیئرمین)	07
کورس کا تعارف	ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ (کورس رابطہ کار)	09
یونٹ نمبر:1	بلوچستان اور بلوچی زبان	11
یونٹ نمبر:2	بلوچ تہذیب و ثقافت	25
یونٹ نمبر:3	بلوچی لوک ادب	45
یونٹ نمبر:4	رومانوی کہانیاں	59
یونٹ نمبر:5	دینی ادب	85
یونٹ نمبر:6	بلوچی کے صوفی شاعر	99
یونٹ نمبر:7	جدید بلوچی شاعری	111
یونٹ نمبر:8	بلوچی افسانوی ادب	139
یونٹ نمبر:9	بلوچستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز	157

پیش لفظ

پاکستان متنوع ثقافتوں اور زبانوں کا ایک منفرد گہوارہ ہے، جہاں ہر خطے کی زبان، ادب اور تہذیب اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ یہی لسانی اور تہذیبی تنوع ہماری قومی یکجہتی کی بنیاد ہے، جو ہمیں دنیا میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک قوم کی فکری، ادبی اور تہذیبی شناخت کا مظہر بھی ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے ماضی کو محفوظ کرتی ہے، بلکہ ہمارے مستقبل کی تعمیر میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی جو ہمیشہ علم کی روشنی کے پھیلانے میں پیش پیش رہی ہے، نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بی ایس سطح پر پاکستانی زبانوں کے چار نئے کورسز متعارف کروائے ہیں۔ یہ کورسز پشتو، پنجابی، بلوچی اور سندھی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کا جامع مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کورسز کا مقصد نہ صرف طلبہ کو پاکستانی زبانوں اور ان کے ادبیات سے روشناس کرانا ہے، بلکہ انھیں پاکستان کی تہذیبی گہرائیوں اور متنوع ثقافتی ورثے کی اہمیت کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کرنا ہے۔

بی ایس کے ان تدریسی کورسز میں پاکستان کی لوک کہانیوں، صوفیانہ شاعری، دینی ادب اور جدید افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے تاریخی آثار، تہذیبی مراکز اور ان زبانوں کی جغرافیائی اور تاریخی ارتقا کے بارے میں تدریسی یونٹ شامل ہیں۔ ان کورسز کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ نسلِ نو کو ان کے عظیم ثقافتی اور ادبی ورثے سے قریب لانے کا ذریعہ بنیں گے۔

یہ کورسز قومی یکجہتی اور ملی ہم آہنگی کو فروغ دینے کا ایک مضبوط وسیلہ بنیں گے، کیونکہ طلبہ اپنی مادری زبان کے بجائے دیگر زبانوں کے کورسز کا انتخاب کریں گے، جو انھیں وطنِ عزیز کی مختلف ثقافتوں کو سمجھنے اور ان کا احترام کرنے کی تربیت دیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کورسز کے ذریعے طلبہ پاکستانی زبانوں، ان کے ادبیات اور تہذیب و ثقافت کی گہرائیوں میں اتر کر ان کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور اپنے قومی ورثے کی اصل بنیادوں کی تہ تک پہنچیں گے۔ یہ قدم نہ صرف تعلیمی میدان میں ایک انقلابی پیش رفت ہے، بلکہ یہ ہمارے سماجی و ثقافتی شعور کو بھی تقویت بخشے گا۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہمیشہ علم و ادب کی تدریس، تحقیق اور وطنِ عزیز کی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے کوشاں رہی ہے۔ یہ اس مشن کو مزید وسعت دینے کی طرف ایک اور قدم ہے۔ شعبہ پاکستانی زبانیں کی یہ

قابلِ ستائش کاوش اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نہ صرف تعلیمی ترقی کے لیے کوشاں ہے، بلکہ پاکستان کے لسانی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت اور فروغ میں بھی اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر رہی ہے۔ میں ان کورسز کی پیشکش پر شعبے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ یہ کورسز ہماری نئی نسل کی فکری، سماجی اور ثقافتی تربیت میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر ناصر محمود
وائس چانسلر
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

دیباچہ

پاکستان کی سرزمین اپنی منفرد ثقافتی، لسانی اور تہذیبی رنگارنگی کے باعث دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہاں بولی جانے والی زبانیں، رچائی ہوئی ثقافتیں اور قدیم تہذیبوں کے مظاہر اس خطے کے عظیم تاریخی ورثے کی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستانی زبانیں نہ صرف لسانی تنوع کی علامت ہیں بلکہ یہ مختلف خطوں کی تہذیبی، ادبی اور فکری روایتوں کی امین بھی ہیں۔ یہ ہماری قومی شناخت کو مضبوط کرتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر سرزمین پاک کو ایک منفرد پہچان فراہم کرتی ہیں۔

شعبۂ پاکستانی زبانیں، اس عظیم ثقافتی ورثے کی حفاظت اور اس کی ترویج کے لیے کوشاں ہے۔ یہ شعبہ نہ صرف پاکستانی زبانوں کی تدریس کا ایک اہم مرکز ہے، بلکہ ان زبانوں کے ادب، ثقافت اور لسانی سرمائے پر تحقیق کے لیے ایک مضبوط علمی بنیاد بھی فراہم کر رہا ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے 2004ء میں شعبے نے ایم فل پاکستانی زبانیں و ادب پروگرام کا آغاز کیا، جس نے پاکستانی زبانوں کے ادبی، لسانی اور تحقیقی مطالعات کے میدان میں نئے امکانات پیدا کیے۔ 2008ء میں، اس سفر کو مزید وسعت دیتے ہوئے شعبے نے پی ایچ ڈی پروگرام کا اجرا کیا، جو وطن عزیز میں پاکستانی زبانوں کے ڈسپلن میں اولین پروگرام ہے۔

جناب وائس چانسلر کی دوراندیش قیادت اور وژن کی روشنی میں، شعبہ پاکستانی زبانیں اب ایک نئے سنگ میل کی طرف بڑھ رہا ہے اور عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر پاکستانی زبانوں اور ان کے ادبیات کے ساتھ ساتھ وطن عزیز کے مختلف خطوں کی تہذیب و ثقافت کے مطالعات پر مبنی نئے چار کورسز کا آغاز کر رہا ہے، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

- پشتون: تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب (سطح بی ایس)
- بلوچ: تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب (سطح بی ایس)
- سندھی تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب (سطح بی ایس)
- پنجابی تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب (سطح بی ایس)

ان کورسز کی پیشکش اور انتخاب کا طریقِ کار کچھ اس طرح سے ہے کہ:

- یہ کورسز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تمام بی ایس پروگراموں کے اسکیم آف اسٹڈیز کا حصہ ہوں گے۔
- بی ایس کے طلبہ ان کورسز میں سے کسی ایک کورس کا انتخاب کریں گے۔
- طلبہ اپنی مادری زبان کا کورس لینے کے اہل نہیں ہوں گے، بلکہ انھیں دیگر تین زبانوں میں سے کسی ایک کورس کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

یہ کورسز درج ذیل مقاصد کے تحت پیش کیے جارہے ہیں:

- پاکستانی زبانوں کے ادبیات اور پاکستانی تہذیب و ثقافت کی تدریس سے قومی یکجہتی کو فروغ دینا۔
- گلوبلائزیشن کے نتیجے میں پاکستانی زبانوں، ان کے ادبیات اور تہذیب و ثقافت سے نسلِ نو کی دوری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کو کم کی سمعی کرنا اور طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے ادبیات اور تہذیب و ثقافت سے روشناس کروانا۔
- طلبہ کو پاکستان کی اکائیوں کی تاریخ، حدود اربعہ، لسانی جغرافیے اور پاکستانی زبانوں کے آغاز وارتقا سے روشناس کروانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے لوک ادب سے آگاہی دلانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے صوفیانہ ادب سے متعارف کروانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے جدید شعری ادب سے آگاہی دلانا۔
- طلبہ کو پاکستانی زبانوں کے دینی ادب (حمد، نعت، سیرتِ رسولؐ، تفاسیر، احادیث کے تراجم) سے روشناس کرانا۔
- طلبہ کو پاکستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز سے روشناس کرانا۔

بحیثیت مجموعی طلبہ کو پاکستانی زبانوں، ادبیات اور تہذیب و ثقافت کے مطالعے کے لیے ٹھوس بنیادیں مہیا کرنا، ان چار کورسوں کا بنیادی مقصد ہے۔

پاکستانی زبانوں کے یہ کورسز نہ صرف قومی یکجہتی اور ملی ہم آہنگی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کریں گے، بلکہ ان کے ذریعے نسلِ نو، جو اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے دور ہوتی جارہی ہے، اپنے عظیم تہذیبی ورثے سے آگاہ ہو گی اور اس کی اہمیت بھی جان سکے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
صدرِ شعبہ

کورس کا تعارف

یہ کورس بلوچستان کی تہذیب، ثقافت، زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں کو عمیق اور جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کو بلوچستان کے تاریخی، لسانی، ادبی اور ثقافتی ورثے سے روشناس کروانا اور ان کی فکری و علمی صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔ کورس کو اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ طلبہ نہ صرف بلوچی زبان و ادب بلکہ بلوچ معاشرت اور تاریخی آثار کو بھی گہرائی سے سمجھ سکیں۔ یہ کورس نو یونٹوں پر مشتمل ہے، جن میں ہر یونٹ ایک مخصوص موضوع کا احاطہ کرتا ہے تاکہ طلبہ و طالبات بلوچستان، بلوچی زبان اور بلوچ تہذیب و ثقافت کے متنوع رنگوں سے آشنا ہو سکیں۔ اس کورس کے تمام یونٹ تجربہ کار اہلِ قلم نے تحریر کیے ہیں۔

یونٹ نمبر 1: بلوچستان اور بلوچی زبان کے حوالے سے ہے، جس میں تاریخ، لسانی جغرافیہ، بلوچی زبان کے آغاز و ارتقا، صوتیاتی نظام، اور بلوچی لہجوں کا فرق شامل ہے۔

یونٹ نمبر 2: بلوچ تہذیب و ثقافت پر مبنی ہے، جس میں بلوچ معاشرت، ثقافتی اقدار جیسے میر، ہڈ پروشی، بلوچی دود، میٹر مرکہ، لج و میار، مہمان نوازی، قول و اقرار کی پاسداری، بہادری، اور بلوچ سماج میں عورت کا مقام شامل ہیں۔

یونٹ نمبر 3: بلوچی لوک ادب پر محیط ہے، جس میں بلوچی لوک ادب کے مختلف اصناف جیسے سپت، لولی، سوت، لاڑوگ، زہیروک، ڈیہی، لیکو، دستانگ، اور مودگ کے مختلف فارم اور موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یونٹ نمبر 4: بلوچی کے رومانوی قصوں اور داستانوں پر مختص ہے، جس میں ہانی شے مرید، بیبرگ گراناز، شہداد و مہناز، کیاسدو، حمل و ماہ گنج، اور عزت و مہرک کی داستانیں شامل ہیں۔

یونٹ نمبر 5: بلوچی زبان میں دینی ادب کی روایت پر محیط ہے، جس میں بلوچی حمدیہ، نعتیہ ادب کے ساتھ ساتھ قرآنی تراجم، تفاسیر، احادیث کے تراجم، اور سیرت النبیؐ کو شامل کیا گیا ہے۔

یونٹ نمبر 6: بلوچی کے صوفی شعرا کے حوالے سے ہے، جس میں مست توکلی، جام درک، جوانسال بگٹی، اور تاج محمد تاجل کے کلام میں موجود روحانی، اخلاقی اور فلسفیانہ پیغام کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یونٹ نمبر 7: جدید بلوچی شاعری پر مبنی ہے، جس میں میر گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، سید ظہور شاہ ہاشمی، مراد ساحر، عطا شاد، اکبر بارکزئی، بشیر بیدار، اللہ بخش بزدار اور مبارک قاضی کی شاعری، فنی کمالات، موضوعات اور خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

یونٹ نمبر 8: بلوچی افسانوی ادب کے ارتقا، موضوعاتی تنوع اور ادبی اسالیب کے بیان پر مشتمل ہے اس یونٹ میں بلوچی افسانہ، ناول، اور ڈرامہ کی فنی و فکری جہات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

یونٹ نمبر 9: بلوچستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز پر مشتمل ہے، جن میں مہر گڑھ، لورالائی کے آثار، درۂ بولان، میری قلات، شئے روغان، اربوئی، پیر غیب آبشار، گوادر، ھنہ جھیل، ہنگول نیشنل پارک، ہزار گنجی اور چلتن نیشنل پارک شامل ہیں۔

عزیز طلبہ و طالبات! یہ کورس بلوچی زبان، بلوچوں کی تہذیب و ثقافت کے مطالعے کے لیے ایک اہم رہنما ہے جو آپ کو بلوچی زبان و ادب اور بلوچوں کے ثقافتی ورثے سے روشناس کرائے گا۔

(ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بلوچ)

کورس رابطہ کار

یونٹ نمبر 1:

بلوچستان اور بلوچی زبان

تحریر: ڈاکٹر واحد بخش بزدار

نظر ثانی: ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ

فاصلاتی تشکیل: پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

فہرست

	یونٹ کا تعارف	13
	مقاصد	13
1	بلوچستان اور بلوچی زبان	14
1.1	تاریخ	14
1.2	حدود اربعہ	16
1.3	لسانی جغرافیہ	16
1.4	بلوچی زبان کا آغاز وارتقا	17
1.5	مشترک بلوچی کا تصور	19
1.6	بلوچی صوتیاتی نظام	19
1.7	مستعار صوتیے	19
1.8	بلوچی زبان کے لہجے	20
1.9	لہجوں کا فرق	20
	خود آزمائی	22
	حوالہ جات	23

یونٹ کا تعارف

بلوچستان رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے جبکہ اس کی آبادی پاکستان کے تمام صوبوں سے کم ہے۔ پاکستان کی قدیم تہذیب مہر گڑھ اسی صوبے میں ہے۔ یہ صوبہ خوبصورت وادیوں، چٹیل میدانوں، ریگستانوں اور ساحلِ سمندر پر مشتمل ہے جو اپنی قدیم تاریخ، جغرافیہ اور لینڈ اسکیپ کی وجہ سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

یہ یونٹ بلوچستان کی تاریخ، جغرافیہ، اور بلوچی زبان کے ارتقائی عمل کو جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس یونٹ میں بلوچستان کی حدود اربعہ، تاریخی اہمیت، اور بلوچی زبان کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مزید برآں، مشترک بلوچی زبان کے تصور، بلوچی صوتیاتی نظام، مستعار صوتیوں، اور زبان کے مختلف لہجوں کے فرق کا تفصیلی جائزہ بھی شامل ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو مکمل کرنے کے بعد طلبہ:

1. بلوچستان کی جغرافیائی حدود اور تاریخی اہمیت کی وضاحت کر سکیں گے۔
2. بلوچی زبان کے آغاز و ارتقا کے مراحل کا تجزیہ کر سکیں گے۔
3. مشترک بلوچی کے تصور اور اس کی بنیادوں کو سمجھ سکیں گے۔
4. بلوچی زبان کے صوتیاتی نظام اور مستعار صوتیوں کی ساخت اور اہمیت کو بیان کر سکیں گے۔
5. بلوچی زبان کے مختلف لہجوں اور ان کے فرق پر گفتگو کر سکیں گے۔

1۔ بلوچستان اور بلوچی زبان

رقبے کے لحاظ سے بلوچستان پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور تاریخی، ثقافتی اور جغرافیائی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خطے کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، جس کا آغاز دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک، مہر گڑھ سے ہوتا ہے، جہاں زراعت اور مویشی پالنے کی بنیاد رکھی گئی۔ قدیم دور میں یہ علاقہ ہخامنشی سلطنت کا حصہ رہا اور 326 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے بھی یہاں قدم رکھا۔ ساتویں صدی میں اسلام کی آمد کے بعد یہ اسلامی تہذیب کا حصہ بنا اور مختلف ادوار میں بلوچ قبائل نے اپنی منفرد شناخت قائم کی، خاص طور پر قلات کی خانیت 17 ویں اور 18 ویں صدی میں ایک مضبوط ریاست کے طور پر ابھری۔ برطانوی دور میں بلوچستان کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا، اور 1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد یہ پاکستان کا حصہ بنا، جبکہ 1970ء میں اسے باقاعدہ صوبے کا درجہ دیا گیا۔ مختلف قوموں اور زبانوں کی موجودگی اس خطے کو ثقافتی طور پر متنوع بناتی ہے، اور اس کی روایات، موسیقی، اور ادب اس کی منفرد شناخت کا حصہ ہیں۔ قدرتی وسائل، خوبصورت جغرافیہ، اور ثقافتی ورثہ بلوچستان کو پاکستان کا ایک اہم اور منفرد خطہ بناتے ہیں۔

1.1 تاریخ:

مہر گڑھ اور کیچ مکران میں میری قلات کے تہذیبی آثار سے پہلے قدیم سومیری (sumerian) اور اکادی (Akkadian) تحریروں میں ماگان (Magan) اور ملوحہ / ملوخہ (Meluhha) علاقوں کا ذکر ملتا ہے۔

محققین کی ایک بڑی اکثریت کا خیال ہے کہ ماگان کا لفظ موجودہ مھران کی صورت میں آج بھی محفوظ اور مستعمل چلا آرہا ہے۔ ہرز فیلڈ (Herzfeld) کے مطابق ماگان خلیج عمان کے دونوں اطراف پر مشتمل تھا اور ان کا خیال ہے کہ ماگان کا نام مکران کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ یہ ایک جغرافیائی اصطلاح اور ترکیب ہے جو جنوب مشرقی ایران اور جنوب مغربی پاکستان کے ساحلی علاقوں کے لیے مستعمل تھا۔ (Herzfeld 1968:63:64) جبکہ Hansmen ایرانی بلوچستان میں جنوبی کرمان کے مشرقی کوہ گان اور مشرقی مکران کو ملوحہ اور ملوخہ قرار دیتے ہیں۔ (Hansinan 1973:55:78)

ملوحہ کے بارے میں وٹزل لکھتے ہیں کہ کچھ ایسے اشارے ملے ہیں کہ دراوڑیوں کی ہجرت سے پہلے سندھ میں ایک اور زبان مروج تھی۔ سومیر اور بعد کے میسوپوٹیمیا اور سندھ تہذیب کے درمیان ہونے والی تجارت کے نتیجے میں کچھ ایسے الفاظ ملتے ہیں جو دراوڑی نہیں ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ اس زبان کو "ملوحی زبان" کہا جائے، جسے سومیریوں نے ملوحہ / ملوخہ لکھا ہے۔ یہ زبان سومری اور عیلامی سے مختلف تھی (Witzel (Possebl 1999:24 کے مطابق ملوحہ کا مرکز بلوچستان کے پہاڑوں میں کہیں واقع تھا، جو ابتدائی انڈس تہذیب کے قریب تھا (Possehl 1996:136-) ممکن ہے کہ براحشی (Barah-shi) زبان ملوحہ کے علاقہ کی زبان تھی۔ (Witzel 1999:24)

مہر گڑھ تہذیب (3300-8000 قبل مسیح) کی دریافت سے پہلے عام طور پر وادی سندھ کی تہذیب کو جنوبی ایشیا کا قدیم ترین تہذیب خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن مہر گڑھ کے دریافت کے بعد بلوچستان کی تہذیبی تاریخ دس ہزار سال پیچھے چلی جاتی ہے۔ جہاں 8 ہزار قبل مسیح میں مہر گڑھ کی مقام پر ابتدائی زرعی پیش رفت کا آغاز ہوا جو بعد میں 1300-3300 قبل مسیح میں ایک وسیع کانسی (Bronze) تہذیب کی صورت میں ہڑپا یا وادی سندھ کی صورت میں سامنے آیا۔ مہر گڑھ تہذیب کے علاوہ بلوچستان میں میری قلات کے تہذیبی آثار انتہائی اہمیت کے حامل ہیں جو 5 ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔

سومیری اور اکادی تحریروں کے بعد مکران کا دوسرا تاریخی حوالہ ہخامنشی بادشاہوں کے عہد میں ملتا ہے۔ جہاں مکران کو "ماکا" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ داریوش (486-522 قبل مسیح) کے عہد میں ماکا یعنی مکران چودھویں صوبے کے طور پر ان کی سلطنت کا حصہ تھا۔ بیستون کے تین لسانی کتبوں یعنی بابلی کتبوں میں اسے Ma-ak اور قدیم فارسی میں اسے ماکا (Maka) لکھا گیا ہے۔ جبکہ سکندر اعظم کے حملے کے دوران یونانی مورخین نے اپنے تحریروں میں مکران کو گدروشیا لکھا ہے۔

ہخامنشی اور یونانی حکمرانوں کے بعد بلوچستان میں ساسانی اور عربوں کی حکومتیں قائم رہیں۔ اب تک کی دستیاب حوالوں کی روشنی میں بلوچوں سے متعلق پہلا بیان مشہور عرب مورخ احمد بن یحیٰی بلاذری (892-815ء) کا ہے۔ جنہوں نے اپنی کتاب "فتوح البلاان" غالباً نویں صدی عیسوی کے نصف میں لکھی (Baloch1964:49) اس کے بعد ابن حوقل (950ء) وہ دوسرے مورخ ہیں، جنہوں نے اپنی تحریروں میں کوچ اور بلوچ لوگوں کا تذکرہ ایک ساتھ کیا ہے۔ (Haukal 1800:92)

ان کے علاوہ دوسرے عرب مورخین بیہقی، اصطخری، البیرونی، یعقوبی، مولانا منہاج سراج نے اپنی تحریروں میں بلوچوں کو بلوص، البلوص، بالس، باخوالس، بالش اور بلوچستان کو والشتان لکھا ہے۔ اس حوالے سے منہاج سراج لکھتے ہیں کہ "بیہقی نے باوالس، بالس، والشتان کے نام سے مکران، قصدار (خضدار) و توران کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مقدسی نے بالش لکھا ہے۔ البیرونی نے قانونِ مسعودی اور حیولہ میں بالش اور والشتان لکھا ہے۔ والشانی، بالس، بالش بلوچستان اور سندھ میں تھے (سراج 2004: 381-382)

1.2 حدود اربعہ:

بلوچستان پاکستان کا سب سے وسیع اور جغرافیائی لحاظ سے اہم صوبہ ہے۔ جس کے شمال میں افغانستان، خیبر پختونخوا، جنوب میں بحیرہ عرب، مغرب میں ایران اور مشرق میں صوبہ سندھ و پنجاب واقع ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے بلوچستان، پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ جس کا کل رقبہ 188، 347 مربع کلو میٹر پر محیط ہے۔ جو پاکستان کے مجموعی رقبے کا تقریباً 43.6 فیصد بنتا ہے۔ اس کا 835 کلو میٹر ایران، 1120 کلو میٹر طویل سرحد افغانستان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ جبکہ 760 کلو میٹر طویل ساحلی پٹی بلوچستان میں ہے۔ جس میں اورماڑہ، جیونی، سونمیانی، پسنی اور گوادر واقع ہیں۔

1.3 لسانی جغرافیہ:

موجودہ عہد میں بلوچ اور بلوچی بولنے والے لوگ پاکستان کے علاوہ ایران، افغانستان، ترکمانستان، خلیجی ریاستوں اور مشرقی افریقہ (کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا) کے علاقوں میں آباد ہیں۔ پاکستانی صوبہ بلوچستان کی سب سے بڑی آبادی ان بلوچ قبائل پر مشتمل ہے جو بلوچی بولتے ہیں اور ماسوائے خالص پشتون علاقوں کے یہ زبان ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وسطی بلوچستان کے براہوئی بھی بلوچی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں۔ کوہِ سلیمان میں آباد بلوچ قبائل کے علاوہ ڈیرہ غازی خان اور راجن پور کے اضلاع میں بلوچی بولی جاتی ہے۔ سندھ میں شکارپور، جیکب آباد، سانگھڑ، میرپور، نواب شاہ اور کراچی میں ایک بہت بڑی آبادی کی مادری زبان بلوچی ہے۔ ایران کا موجودہ صوبہ سیستان اور بلوچستان کی اکثریتی آبادی بلوچ قبائل پر مشتمل ہے اور بلوچی ان کی مادری زبان ہے۔ افغانستان میں ہلمند کا ایک حصہ یعنی فراح، چکنسور اور گرم سیل کے علاوہ شوراوک اور ہرات میں بادِغیس تک قدیم عہد سے بلوچ آباد ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔ ترکمانستان کے علاقہ "ماری" میں کم و بیش پچاس ہزار کے قریب بلوچ آباد ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔ بلوچوں کی ایک

اچھی خاصی تعداد خلیجی ممالک کے متعدد علاقوں میں آباد ہے۔ جو بھی بلوچی بولتے ہیں۔ مشرقی افریقہ میں تنزانیہ، یوگنڈا اور کینیا میں بھی بلوچوں کی بستیاں ہیں۔ بلوچی زبان پر وہاں کی مقامی زبانوں کے اثرات حاوی ہو گئے ہیں۔ بڑے اور بوڑھے افراد کے علاوہ نوجوان نسل بلوچی زبان سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔

1.4 بلوچی زبان کا آغاز وارتقا:

عام طور پر قدیم ایرانی زبانوں اور ان کے لہجوں کو درج ذیل تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ **اوستائی:** مشرقی ایرانی زبانیں/لہجے جن میں اوستا یا اوستائی زبان سب سے اہم اور نمایاں زبان ہے۔

2۔ **میدی:** مرکزی اور مغربی زبانیں/لہجے۔ جن میں سب سے زیادہ قدیم میدی یا مادی زبان ہے۔

3۔ **قدیم فارسی:** جنوبی زبانیں/لہجے جسے فارسی باستان یا قدیم فارسی کہتے ہیں۔

بلوچی زبان کا مذکورہ قدیم ایرانی زبانوں سے تعلق اور لسانی گروہ بندی کے بارے میں اگرچہ مختلف ادوار میں مختلف اور متضاد نظریات وخیالات دیکھنے کو ملتے ہیں، تاہم اس ضمن میں چند نمایاں نظریات کا ذکر کرنا یہاں مناسب ہو گا۔ جدید فارسی سے قربت رکھنے کے باعث شروع میں بلوچی کے بارے میں یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ فارسی کی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ شکل ہے۔ مگر بعد کی تحقیقات نے نہ صرف اس مفروضہ کو مسترد کیا بلکہ بلوچی کی قدامت اور اس کی انفرادی خصوصیات پر تصدیق کی مہر ثبت کی۔

گریئرسن لکھتے ہیں کہ "اگرچہ بلوچی فارسی سے قربت رکھتی ہے لیکن اس کے پرکھنے کا یہ طریقہ کہ اسے فارسی کی شاخ سمجھا جائے، غلط ہو گا کیونکہ بلوچی زبان ایرانی زبانوں میں سے ایک الگ انفرادی حیثیت کی مالک ہے۔ قدیم فارسی جو ہخامنشی بادشاہوں کی سرکاری زبان تھی اور جس سے موجودہ فارسی نکلی ہے، بلوچی اس سے کہیں زیادہ قدیم اوستائی سے تعلق رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ قبائلی طرز کی ایک ایسی گفتگو ہے جو قدیم زمانے میں اپنے طور پر ارتقاء پذیر رہی ہے اور یہ دوسری زبانوں کی نسبت فارسی کے قریب ہے اور اسی وجہ سے اسے فارسی کی مسخ شدہ صورت کہی جاتی رہی ہے۔(Grcerson 1921:327)

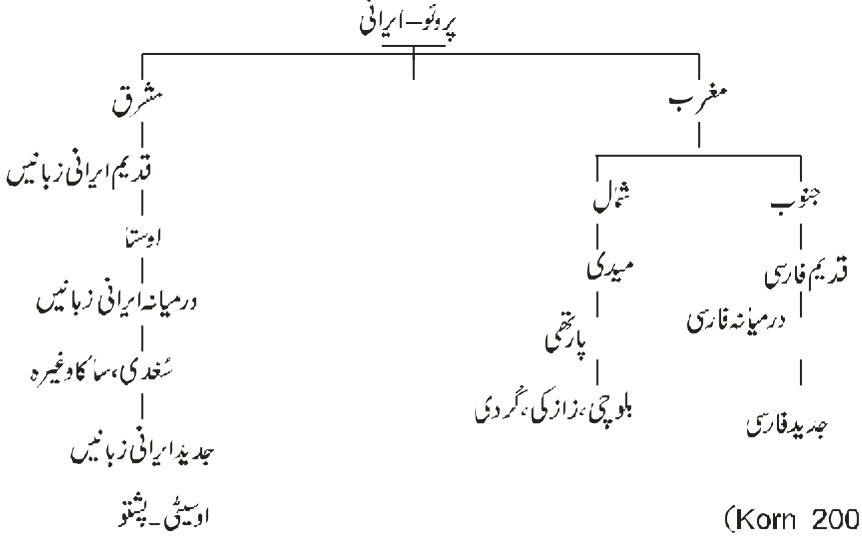
گریئرسن کے برعکس لانگ ورتھ ڈیمز کا خیال ہے کہ بلوچی ایک ایرانی زبان ہے۔ یہ مشرقی ایرانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر چند کہ بعض مقامات میں یہ اوستا سے کہیں زیادہ قدیم فارسی سے مشابہت رکھتی ہے۔ (Dames 1913:363) کرنل ای مالکر کا خیال ہے کہ "یہ آریائی زبان کی ایک ایرانی شاخ ہے اور پہلوی زبان کی بہن معلوم ہوتی

ہے۔ ایک ایسی شاخ جو یقیناً پہلوی کی طرح اور اس کے دوش بہ دوش وقت کے ایک خاصی حصہ میں قدیم فارسی سے نکلی ہوئی ہو اور میرے خیال میں بھی موجودہ بلوچی زبان قدیم فارسی سے نکلی ہوئی ہے اور مکران میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہے(Mockler 1877:2)

اوستا اور قدیم فارسی کی بجائے بعض محققین بلوچی زبان کو شمال مغربی ایرانی زبان قرار دے کر اس کا تعلق میدی(Median)شاخ سے جوڑتے ہیں۔ اس ضمن میں Tedesco نے ایرانی زبانوں پر وسیع اور دقیع تحقیق کرتے ہوئے بلوچی کو شمال مغربی ایرانی زبان قرار دیا ہے۔(Tedesco 1921:252)

قارینا جہانی بھی بلوچی زبان کے تعلق کو ایرانی زبانوں کی شمال مغربی شاخ سے جوڑتی ہیں (Jahani 1946:105)

بہر حال ایرانی زبانوں کی تقسیم اور بلوچی زبان کی پوزیشن کو درج ذیل لسانی شجرہ کی رو سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔



(Korn 2003:50)

اگنس کورن اگرچہ بلوچی زبان کو شمال مغربی ایرانی سلسلے ہی کی زبان قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے خیال میں چند صوتیاتی تغیر و تبدل کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مغربی ایرانی زبانوں کے مابین ربط و تعلق کو نہ تو ایک شجرہ حسب و نسب کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے شمالی پیمانے(Scale of Northernes)کی صورت دی جا سکتی ہے۔(Korn 2003:59)جبکہ حقیقت بھی یہ ہے کہ بلوچی اور قدیم ایرانی زبانوں (اوستا، میدی، قدیم فارسی) کے حوالے سے جو لسانی فرق و امتیاز کی صورتیں(Isoglosses)اور نمونے دیکھنے کو ملتی ہیں، وہ بھی کسی قطعی

کسوٹی یا پیمانے کی عکاسی نہیں کرتیں۔ اسی طرح Skjaervo بھی اگرچہ بلوچی زبان کو میدی (Median) گروہ سے متعلق نہیں سمجھتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ قدیم ایرانی اوستا، میدی، درمیانہ ایرانی پارتھی، باختری، کروشمی اور سُغدی کے علاوہ بلوچی، کردی، پشتو اور اوسیٹی کو بھی پروٹو وسطی ایرانی گروہ سے متعلق سمجھتے ہیں جبکہ وہ قدیم فارسی، درمیانہ فارسی اور جدید فارسی کو پروٹو جنوب مغربی ایرانی گروہ سے جوڑتے ہیں۔ (Skjaervo2000:103) اس کے علاوہ بلوچی زبان میں بڑے پیمانے پر ایک ماقبل ایرانی (Pre-Iranian) لسانی زیریں تہہ (Substrate) دیکھنے کو ملتا ہے۔ جو واضح طور پر نائیجر، کانگو اور افروایشائی (Afroasiatic) زبان سے متعلق ہے۔

1.5 مشترک بلوچی (Common Balochi) کا تصور:

مشترک بلوچی کا تصور سب سے پہلے مورگن سٹرائن (Morgenstierne1448:225) نے پیش کیا۔ تاہم اس نے اس کی کوئی خاص وضاحت بھی نہیں کی۔ البتہ اس سے بلوچی زبان کی وہ ابتدائی صورت مراد لی جاتی ہے جو مختلف لہجوں میں منقسم ہونے اور ان کے مابین جنم لینے والے فرق و اختلاف سے پہلے مکمل طور پر یگانگت اور وحدت کا حامل تھی۔ بالفاظ دیگر ایک طرف بلوچی زبان کا ہند آریائی زبانوں اور دوسری طرف جدید فارسی سے رابط و تعلق سے قبل کے عہد کو مشترک بلوچی کا عہد تصور کیا جاتا ہے۔ مرور ایام کے ساتھ بلوچی زبان کے اصل صوتیاتی نظام میں مختلف مستعار صوتیوں اور ذخیرہ الفاظ کے دخیل ہونے کے نتیجے میں مختلف لہجے وجود میں آئے۔ جنہیں عام طور پر مکرانی، رخشانی اور سلیمانی لہجوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

1.6 بلوچی صوتیاتی نظام:

عام طور پر بلوچی کے موجوہ صوتیات کی درجہ بندی دو طرح سے کی جاتی ہے۔

1۔ بلوچی کے اصل اور بنیادی صوتیے

2۔ مستعار صوتیے

بنیادی صوتیے: اب پ ت ج چ د ر ز ژ س ش ک گ ل م ن و ہ ی ر ے

1.7 مستعار صوتیے:

1۔ عربی، فارسی، خ غ ف

2۔ ہند آریائی: ٹ ڈ ڑ

سلیمانی لہجے کے برعکس رخشانی اور مکرانی لہجوں میں بہت حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ تاہم ان میں ایک طرف وہ دخیل تین صوتیے خ غ اور ف ہیں جو سلیمانی لہجے کی طرح رخشانی لہجے میں بھی مستعمل ہیں۔ اسی طرح سلیمانی لہجے میں خ غ اور ف کے علاوہ ث اور ذ بھی مستعمل ہیں جو مکرانی اور رخشانی میں مقصود ہیں۔

اگرچہ ف ث اور خ قدیم ایرانی میں بھی ملتے ہیں جبکہ درمیانی اور آخری حالت میں مستعمل ذ اور غ کا چلن ہمیں قدیم فارسی اور جدید اوستا میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن سلیمانی لہجے کے بارے میں وثوق سے کہا نہیں جا سکتا ہے کہ آیا یہ آوازیں قدیم فارسی اور اوستائی عہد کا شاخسانہ ہیں یا یہ بعد کی کوئی پیش رفت۔ اس کے علاوہ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عربی ء کو بھی بلوچی صوتیاتی نظام میں شمار کیا جاتا ہے۔ تاہم عربی ء اور لا مصوتی صوتیہ (Consonantal Phoneme) کے برعکس دونوں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کا مصمتی صوتیہ (Vowel Phonemes) ہیں۔

1.8 بلوچی زبان کے لہجے:

بلوچی زبان کے تین بڑے لہجے مکرانی، رخشانی اور سلیمانی ہیں۔

مکرانی لہجہ: مکران علاقہ کی وجہ سے اسے مکرانی لہجہ کہا جاتا ہے۔ اسے بلوچی زبان کا جنوبی لہجہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لہجہ مکران ڈویژن، کراچی اور ایرانی بلوچستان کے علاوہ خلیجی ممالک میں بولا جاتا ہے۔

رخشانی لہجہ: دریائے رخشان کی وجہ سے اسے رخشانی لہجہ کہا جاتا ہے یہ لہجہ نوشکی، خاران، چاغی، دالبندین، تفتان کے علاوہ افغانستان، ایرانی بلوچستان اور ترکمانستان میں بولا جاتا ہے۔

سلیمانی لہجہ: سلیمانی لہجہ جسے مشرقی یا شمالی بلوچی لہجہ بھی کہا جاتا رہا ہے یہ لہجہ مشرقی بلوچستان سمیت کوہ سلیمان، ڈیرہ غازی خان، راجن پور اور سندھ کے بعض علاقوں کشمور، جیکب آباد، شکارپور، سانگڑھ اور نواب شاہ میں بھی بولا جاتا ہے۔

1.9 لہجوں کا فرق:

بلوچی زبان کے ان تینوں لہجوں میں اگرچہ کوئی نمایاں فرق نہیں ہے تاہم مکرانی اور رخشانی کے برعکس سلیمانی لہجہ میں واول (Vowels) کے بعد مستعمل ہونے والے صوتیے گ، پ، ک، ت اور د کو بالترتیب غ، ف، خ، ث اور ذ میں بدلنے کا رجحان ملتا ہے۔ جبکہ الفاظ کے شروع میں یہ صوتیے اُسی طرح اپنی شکل میں برقرار رہتے ہیں مثلاً

گ/ر/غ کا فرق

مکرانی۔ رخشانی لہجہ	سلیمانی لہجہ	اُردو معنی
نندگ	نُندغ	بیٹھنا
گُشگ	گُشغ	کہنا
کنگ	کنغ	کرنا
روگ	روغ	جانا

پ/ر/ف کا فرق

آپ	آف	پانی
شپ	شف	رات
دپ	دف	مُنہ
لاپ	لاف	پیٹ

ک/ر/خ کا فرق

ھاک	ھاخ	ریت
گوک	گوخ	گائے
گنوک	گنوخ	دیوانہ
نوک	نوخ	نیا

ت/ر/ث کا فرق

مات	ماث	ماں
برات	براث	بھائی
پت	پث	باپ
چات	چاث	کُنواں

د/ر/ذ کا فرق

پاد	پاذ	پاؤں
ساد	ساذ	رسی
نود	نوذ	بادل
لد	لذ	جنگل

اسی طرح مکرانی اور رخشانی لہجے کے برعکس سلیمانی لہجے میں بعض اوقات د۔ت۔ز سے قبل کے رکوڑ سے بدل دیا جاتا ہے۔ مثلاً

مکرانی۔رخشانی لہجہ	سلیمانی لہجہ	اُردو معنی
درد	دڑد	درد
لُرد	لڑد	گدلا پانی
ورد	وڑد	خوراک۔غذا
آرت	آڑت	آٹا
ھیرت	ھیڑت	باریک۔پتلا
وارت	واڑت	کھاتا ہے
بُرز	بڑز	بلند
لرزگ	لڑزگ	لرزنا

خود آزمائی

1۔ بلوچستان کی تاریخ اور جغرافیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ بیان کیجیے۔

2۔ بلوچی زبان کے بارے میں مختلف ماہرین کی آراء پر روشنی ڈالیے۔

3۔ بلوچی زبان کے لہجے کتنے ہیں؟ اور ان لہجوں میں کیا فرق ہے؟ وضاحت کیجیے۔

4۔ بلوچی زبان کا لسانی جغرافیہ بیان کیجیے۔

حوالہ جات

1. Baloch, Mir Khuda Bux Bijarani Marri 1964: The Balochies thought centuries, History versus legend, Islamia electric press, quetta
2. Dames, M.L. 1913: "Baluchistan In: Encyclopedia of Islam1,pp 650-666"
3. Greisens, G.A. 1921: "Balochi In linguistic survey of India X:Iranian family, Calcutta".
4. Hansman, John 1973: "A pericplus of Mogan and Meluhha, Bulletin of the school of Oriental and African studies, University of London Vol 36, No 3 PP.554-587"
5. Haukal, Ebn 1800: "The Oriental Geography , printed, at the oriental press, by lvilzon & co (Translated by Sir William Ouseley, Knt LL.D)
6. Herzfield, Ernst 1968: "The Perisan Empire, studies in Geogrpahy and Ethnography of the Ancient Near East, published by F.Steiner, Wieshaden
7. Jahani, Carina 1996: Poetry and politics:Nationalism and language standardization in the Balochi literary movement, In titus paul (e.d) Marginality and Modernity Ethinicity and change in post colonial Balochistan oxford. Pp. 105-137
8. Korn, Agnes 2003: Balochi and the concept of North western Traninan In:Jahani, Carina and Korn, Agnes (eds) The Baolch and their neighbours: ethnic and linguistic contract in Balochistan in historical and Modern Times. Wieshaden, pp. 46-60
9. Morgenstierne, E. 1877: A Grammar of the Balochee Language, as it is spoken Makran London
10. Morgenistirene, G1948: Balochi Miscellanea In acta orientalia 20, pp 253-292

11. Posshel, G.L 1996 Meluhha In Reade Tulian (ed) The Indian Ocean in antiquity Kegan Paul international London pp. 133-208
12. Skjaervo, proks okher 2002: An Introduction to old pension revised and expanded 2nd Version. Source:www.fas_harvard.edu/Iranian/oldepersian
13. Tedesco, Paul 1921: Dialektalogie der mitteliranischen turfantexte In: Monde Oriental 15, pp. 184-258.
14۔ سراج منہاج 2004: طبقات ناصری، جلد اول، اشاعت دوئم، اُردو سائنس بورڈ لاہور، (اُردو ترجمہ: غلام رسول مہر)

یونٹ نمبر2:

بلوچ تہذیب و ثقافت

تحریر: ڈاکٹر واحد بخش بزدار
نظر ثانی: ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل: پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

فہرست

یونٹ کا تعارف		27
مقاصد		27
2	بلوچ تہذیب و ثقافت	28
2.1	تہذیبی پس منظر	28
2.2	بلوچ معاشرہ اور بلوچی ثقافت	29
2.3	بلوچ راج	30
2.4	میر	30
2.5	ہڈ پروشی	31
2.6	بلوچی یا بلوچی دود	31
2.7	میڑ۔ مرکہ۔ جرگہ	31
2.8	دیوان۔ مراگہہ	32
2.9	بلوچی ثقافت کے نمایاں خدوخال	32
2.10	لج و میار	33
2.11	بردباری و وضع داری	34
2.12	مہر و فا	34
2.13	قول و اقرار کی پاسداری	35
2.14	بہادری	35
2.15	باہوٹ	38
2.16	بلوچ سماج میں عورت کا مقام و مرتبت	38
خود آزمائی		42
حوالہ جات		43

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ بلوچ تہذیب و ثقافت کے مطالعے کے لیے ہے۔ جس میں بلوچ قوم کی تاریخی، سماجی اور ثقافتی روایات کو بیان کیا گیا ہے۔ بلوچ معاشرہ اپنی منفرد تہذیبی و ثقافتی خصوصیات جیسے مہر و وفا، لج و میار، میڑ مرکہ اور جرگے کے نظام کے ذریعے دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ اس یونٹ میں بلوچ ثقافت کے مذکورہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ قبیلہ داری نظام، روایتی اقدار اور سماجی رویوں کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو مکمل کرنے کے بعد طلبہ:

1۔ بلوچ تہذیب و ثقافت کی بنیادی ساخت اور تاریخی پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔

2۔ بلوچ معاشرے کے نظام جیسے میڑ، ہڈ پروشی، لج و میار اور بردباری اور دیگر ثقافتی پہلوؤں سے آشنا ہو سکیں گے۔

3۔ بلوچ روایات، رسم و رواج اور ثقافتی اقدار کی اہمیت کو اجاگر کر سکیں گے۔

4۔ بلوچ معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہو سکیں گے۔

2۔ بلوچ تہذیب و ثقافت

2.1 تہذیبی پس منظر:

تہذیب تمام انسانی معاشروں میں پائی جاتی ہے۔ چاہے وہ انتہائی پس ماندہ معاشرہ ہو یا ترقی یافتہ معاشرہ، ہر گروہ یا معاشرے کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ تہذیب کسی گروہ یا معاشرے کے مخصوص اداروں کا ایک مجموعی کل ہوتا ہے۔ جو کسی معاشرے کی مادی، روحانی وسائل، ثقافتی، سیاسی اور قانونی نظام پر مشتمل ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بلوچستان ماقبل تاریخی عہد سے نہ صرف ایک ثروت مند تہذیبی خطہ رہا ہے بلکہ بلوچستان، سطح مرتفع ایران، مشرقی اور وسطی ایشیا کے درمیان مختلف تہذیبوں کا سنگم بھی رہا ہے۔ بلوچستان میں مہر گڑھ تہذیب (3300۔8000 قبل مسیح) کا شمار دنیا کے قدیم ترین تہذیبوں میں سے ہوتا ہے جو بعد میں 3300 سے لیکر 1300 قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں ایک وسیع کانسی (Bronze) تہذیب کی صورت میں وادی سندھ یا ہڑپا تہذیب کی صورت میں سامنے آیا۔ مہر گڑھ کی حجری دور (Neolithic) کی ابتدائی عہد کی زرعی پیش رفت اور سرگرمیاں میسوپوٹیمپیا کے مشرقی سرحد اور علاقہ سے مماثلت (Jarrige 2008:151) رکھتی ہیں۔

مہر گڑھ کے علاوہ کیچ مکران میں میری قلات کے تہذیبی آثار 5 ہزار قبل مسیح جبکہ شاہی تمپ کے آثار 4 ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ (Didier and Murten 2015:300) بلوچستان میں ان قدیم تہذیبی آثار اور انسانی آبادکاریوں کے علاوہ 2500 قبل مسیح کے سومیری (Sumerian) اور اکادی (Akkadian) تحریروں میں ماگان (Magan) اور ملوحہ / ملوخہ علاقوں کا ذکر ملتا ہے۔ ماگان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ موجودہ مغربی مکران اور عمان کے ایک حصے پر مشتمل تھا جبکہ دوسری طرف ملوحہ کے بارے میں Possehl کا خیال ہے کہ اس کا مرکز بلوچستان کے پہاڑوں میں کہیں واقع تھا جو ابتدائی انڈس تہذیب کے قریب تھا۔ (Possehl, 1996:136-8)

وٹزل کے مطابق سندھ کی سومیر اور میسوپوٹیمیا سے تجارت کے نتیجے میں بہت سے ایسے الفاظ ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں جو دراوڑی نہیں ہیں۔ اس لیے اسے "ملوحی زبان" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ سومیریوں نے اس خطے کو ملوحہ کہا تھا اور یہ زبان عیلامی یا سومیری سے مختلف تھی (Witzel 1999:24) الغرض بلوچستان عہد قدیم ہی سے انسانی آباد کاریوں اور قدیم تہذیبوں کا مسکن اور سنگم رہا ہے۔ جہاں آج بھی سینکڑوں قدیم آثاراتی اور آبادکاری کے ٹیلے جنہیں

بلوچی میں "حب" کہا جاتا ہے جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بلوچوں کا قدیم ادب، ان کا فن ہو ہنر ان کا طرز فکر اور نظام اقدار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتدائی عہد میں بلوچ تہذیبی طور پر بہت زیادہ نہیں تو کم تہذیب یافتہ لوگ بھی نہیں تھے۔ لیکن درمیانہ عہد میں اپنے ہمسایہ سلطنتوں اور ریاستوں کے درمیان بغاوتوں، سرکشیوں اور شورشوں کے باعث انہیں نہ صرف نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا بلکہ انہیں ایک منتشر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کیونکہ سلطنتوں اور ریاستوں کی اکھاڑ بچھاڑ کے نتیجے میں نہ صرف آئے دن نئے سرے سے نئی حکومتیں، نئے شہر اور نئی سلطنتیں بنتے اور ٹوٹتے رہتے تھے بلکہ مخالف اور مفتوح آبادیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل اور منتشر کیا جاتا تھا۔

اگرچہ بلوچی زبان ایک انڈوایرانی زبان ہے تاہم بلوچی زبان و ادب میں واضح اور وسیع پیمانے پر ماقبل ایرانی (Pre-Iranian) ذخیرہ الفاظ اور دیومالائی واساطیری سرمایہ کی ایک ایسی قدیم ترین تہہ (Substrate) ملتی ہے جو نائجیر کانگو کی عظیم لسانی خاندان سمیت افروایشائی (Afroasiatic) سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بلوچ ماقبل تاریخی عہد سے ہی مختلف تہذیبوں کے ساتھ ربط و تعلق میں رہے ہیں اور ان کی تاریخی اور تہذیبی اثرات سے مستفید اور فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ ان تہذیبی اثرات کو ان کے زبان و ادب اور افکار و خیالات میں بخوبی طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

2.2 بلوچ معاشرہ اور بلوچ ثقافت:

ثقافت، اکتسابی طرز عمل کا نام ہے۔ اکتسابی طرز عمل میں ہماری وہ تمام عادات، افعال، خیالات اور اقدار شامل ہیں۔ جنہیں ہم ایک منظم معاشرے یا گروہ یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے ان پر عمل کرتے ہیں یا ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ (Shapiro 1957) ثقافت بنیادی طور پر مادی (Material) اور غیر مادی (Non Material) افعال پر مشتمل ہوتی ہے۔ مادی ثقافت میں لباس، خوراک، آرٹ، فن تعمیر وغیرہ جبکہ غیر مادی ثقافت میں خیالات، روایات و اقدار اور عقائد شامل ہوتے ہیں۔ انسانی اور معاشرتی سطح پر تمام معاشروں اور گروہوں کی ثقافت اور ان کے اقدار اور روایات محترم اور مقدس ہوتے ہیں کیونکہ ثقافت کسی معاشرے کی اپنی تخلیق ہوتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگوں کی اپنی باطنی یا روحانی کیفیت (inner soul) اور ایک اندرونی ترکیب و تشکیل (Inner structure) ہوتی ہے۔ کسی کی ثقافت میں کیا اچھا ہے یا کیا برا ہے؟ یہ ان لوگوں کا اپنا مسئلہ ہے کسی دوسرے کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر گروہ اور قوم کی اپنی اپنی معاشرتی سچائیاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی سچائیاں خود تخلیق کرتے ہیں اور وقت کے

ساتھ ساتھ انہیں مسترد بھی کر سکتے ہیں۔ بہر حال ہمیں ان کو تسلیم کرنا چاہیے اور ان کا احترام کرنا چاہیے۔ بنیادی طور پر ہر معاشرہ ایک خاص معاشرتی ڈھانچے کا حامل ہوتا ہے۔ قدیم بلوچ معاشرہ ایک جمہوری اور اخلاقی قبائلی معاشرہ تھا جس میں تمام لوگ ایک طرف مخصوص نظام حیات کے ماتحت اور تابع ہوتے تھے تو دوسری طرف بلا کسی فرق و امتیاز کے ایک وحدت متصور ہوتے تھے۔

2.3 بلوچ راج:

بلوچوں کی قومی ساخت یا تشکیل میں بہت سے قبیلے یا تمن مل کر بلوچ قومیت کی تشکیل کرتے ہیں، جسے بلوچی اصطلاح میں "بلوچ راج" کہا جاتا ہے۔ جبکہ ثقافت کے لیے بلوچی میں "دودءُ ربیدگ" کا اصطلاح مستعمل ہے۔ قدیم بلوچ معاشرے میں قبیلے کا سربراہ ایک شائستہ اور مہذب شخص کو منتخب کیا جاتا تھا جو بردباری، وضع داری، بہادری، سخاوت اور فکر و تدبر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔

2.4 میر:

بلوچی کلاسیکی ادب میں قبیلہ کی سربراہ کے لیے سردار کی بجائے میر کا لفظ دیکھنے کو ملتا ہے جبکہ درمیانہ عہد میں میر کے ساتھ ساتھ قبیلہ کی سربراہ کے لیے سردار کا خطاب بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاہم بلوچ سماج میں میر کا خطاب کسی قبائلی سربراہ کے علاوہ ہر باوقار اور مہذب بلوچ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بلوچ شرافت اور شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں بلوچی میں ایک کہاوت آج بھی مشہور ہے کہ "پیر بوتگ ئے، میر نہ بوتگ ئے" یعنی آپ بڑے ہو کر بھی میر نہ بن سکے۔ اس کا اصل مفہوم یہ کہ اتنی لمبی زندگی گزارنے اور پختہ عمر ہونے کے باوجود بھی آپ ایک باوقار اور مہذب بلوچ نہ بن سکے۔ یہ کہاوت عام طور پر ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کوئی بلوچ، بلوچی روایات و اقدار کے برعکس کوئی غیر شائستہ اور نامناسب حرکت کرتا ہو۔ بہر حال اس بلوچ روایتی مہذب پن اور شائستگی کو عام طور پر "بلوچ ھانوادگی" یعنی بلوچ شرافت اور شائستگی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

بد قسمتی سے برطانوی عہد میں بلوچ قبائلی معاشرے کے روایتی ڈھانچے کو شکست و ریخت سے دوچار کر کے بعض قبائلی سربراہوں کے علاوہ بہت سے نئے سردار بھی بنائے گئے۔ جنہیں برطانوی سرکار نے اپنی مفادات کی تحفظ کی خاطر مراعات و وظائف دینے کے علاوہ عدالتی اختیارات بھی عطا کئے۔ جس کے باعث نہ صرف بلوچی روایتی

معاشرہ اور اسی کا دیرینہ اخلاقی نظام انہدام کا شکار ہوا بلکہ بلوچ عوام کو طبقاتی نظام اور اس کے جبر و استحصال کا نشانہ بھی بننا پڑا۔

2.5 ہڈ پروشی (Bone Breaking)

ہڈ پروشی یعنی "ہڈی توڑنے کی رسم" قدیم بلوچ معاشرے کا ایک ایسا منفرد طرز عمل رہا ہے کہ جس کے تحت کوئی بھی غیر بلوچ شخص یا غیر بلوچ گروہ اپنے گروہ سے ناطہ توڑ کر اگر بلوچ معاشرے میں ضم ہونا چاہتا ہے تو اسے بطور بلوچ قبول کیا جاتا تھا اور بلوچ سودوزیاں میں اسے برابر کا حصہ دار سمجھا جاتا تھا۔ بلوچ معاشرے کا یہ طرز عمل ایک طرف ان کی غیر متعصبانہ رویہ اور رجحان کی دلالت کرتا ہے، تو دوسری طرف شاید اپنی افرادی قوت اور طاقت کو بڑھانے کی فہم و فراست اور حکمت عملی بھی اس طرز عمل میں کارفرما رہی ہو گی۔ بہر حال یہ دونوں صورتیں تنگ نظر بلوچ نسل پرستی یا قوم پرستی کی نفی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

2.6 بلوچی یا بلوچی دود:

اگرچہ عام طور پر "بلوچی" کی اصطلاح بلوچی زبان کے لیے استعمال ہوتی ہے تاہم زبان کے علاوہ یہ اصطلاح عمومی طور پر بلوچ معاشرتی آئین و دستور اور بلوچ نظام حیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس اصطلاح کو بلوچی دُود یعنی بلوچی آئین و دستور بھی کہا جاتا ہے۔ سماجی اور معاشرتی معاملات اور سزا و جزا کے حوالے سے بلوچ ہمیشہ ایک دوسرے سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ 'گوں من بلوچی' بکن یعنی میرے ساتھ بلوچی رواج و اخلاقیات کے مطابق معاملہ کیا جائے۔ اسی طرح جب ایک بلوچ کسی دوسرے بلوچ کے ساتھ کسی قسم کا جارحانہ یا نامناسب رویے کا مظاہرہ کرتا ہے تو اگلا بلوچ اس رویے کے خلاف اجتجاجاً کہتا ہے کہ "من ھم بلوچ یے آں" یعنی میں بھی تو بلوچ ہوں اس سے مراد یہ کہ میں بھی آپ کی طرح ایک وضع دار بلوچ ہوں کوئی کمتر اور حقیر شخص نہیں ہوں۔

2.7 میڑ۔ مرکہ۔ جرگہ:

میڑ یا مرکہ بلوچ معاشرے کا ایک ایسا منفرد رضاکارانہ مصالحتی عمل ہے کہ جس کے تحت ذمہ دار قبائلی شخصیت، سفید ریش بزرگ اشخاص کی سرکردگی میں فرد یا گروہوں کے درمیان کسی بھی مسئلہ اور تنازعہ کو حل کرنے کی رضاکارانہ کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن میڑ لے جانے سے پہلے متاثرہ فریق کی رضامندی بہر حال ضروری ہوتا ہے۔ مرکہ

اصطلاح غالباً افریقی سامی زبان geez کا mekr پنچائیت، جرگہ makara، پنچائیت کرنا جرگہ کرنا کی تقلیبی صورت ہے۔

اس کے علاوہ اکادی Mogana کسی چیز کے ہونے کی اجازت دینا کسی چیز کا معاہدہ کرنا کسی کی التجا کو پذیرائی بخشنا (CDA 188) بھی یکساں دلالت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جبکہ قبائلی جرگہ بلوچ معاشرے کا ایک ادارہ جاتی عمل ہے کہ جس کے ذریعے قبائلی عمائدین پر مشتمل پنچائیت مختلف سماجی اور قبائلی جھگڑوں کا تصفیہ کرتا ہے (JanMahmed 1982) جرگہ کی اصطلاح بنیادی طور پر سومیری Galga کونسل، مشاورت، سے متعلق ہے جو ہماری زبانوں میں جرگہ کی صورت میں مستعمل ہے۔

2.8 دیوان۔ مراگہہ:

بلوچوں کی ثقافتی اور تمدنی زندگی میں دیوان اور مراگہہ یعنی کونسل، اجلاس، اکٹھ کو نہایت ہی اہمیت حاصل ہے۔ جس کے ذریعے وہ مل بیٹھ کر مشاورت اور باہمی گفت وشنید کرتے ہیں قرینِ قیاس یہی ہے کہ مرکہ اور مراگہہ کے دونوں اصطلاحات یکساں ماخذ کی دلالت کرتے ہیں۔

2.9 بلوچی ثقافت کے نمایاں خدوخال:

پاکستان کی تمام قومیں خواہ وہ بلوچ ہوں، سندھی ہوں، پنجابی، سرائیکی یا پشتون ہوں یہ تمام قومیں تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے انتہائی ثروت مند، باوقار اور پر افتخار تہذیبی ورثہ کے حامل ہیں۔ ان کا نظام فکر و احساس، اچھائی اور برائی کے درمیان فرق و اختلاف کا ایک واضح لکیر کھینچتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ تمام معاشرے برائی کے مقابلے میں اچھائی، بدی کے مقابلے میں نیکی اور بزدلی کے مقابلے میں بہادری کو ترجیح دیتے ہیں۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان سب کے اقدار و روایات مشترک ہیں۔ دوستی اور دشمنی کے اصول اور تقاضے، محبت اور نفرت کے رویے اور اظہاریے مشترک ہیں۔ مہمان نوازی، وفاداری، قول و اقرار کی پاسداری، خواتین اور بزرگوں کا احترام جیسی عظیم ثقافتی اقدار بھی ایک سی ہیں۔

اسی طرح بلوچ ثقافت اپنی قدامت، انفرادیت اور تہذیبی گہرائی کی بدولت دنیا کی قدیم اور باوقار ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ثقافت غیرت، عزت، مہمان نوازی، خلوص اور سادگی جیسے اعلیٰ اقدار پر مبنی ہے۔ بلوچوں کا طرزِ

زندگی ان کے ماحول، روایات، اور فطرت کے ساتھ گہرے تعلق کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی موسیقی، لوک کہانیاں، اور رقص محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی تاریخ، جدوجہد، اور اجتماعی یادداشت کی عکاسی کرتے ہیں۔ بلوچی لباس، کڑھائی، زیورات، اور دستکاری میں ان کی فنکاری، جمالیاتی ذوق، اور اپنے خطے سے محبت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔

بلوچی زبان ان کی ثقافتی شناخت، تاریخ اور ادب کا نہ صرف اہم ذریعہ ہے بلکہ ان کے جذبات، خیالات، اور احساسات کو بیان کرنے کا موثر وسیلہ بھی ہے۔ قبائلی نظام میں مشاورت، انصاف پسندی اور بزرگوں کا احترام بلوچ معاشرت کے بنیادی اجزا ہیں، جو ان کی سماجی ہم آہنگی کو مضبوط کرتے ہیں۔ بلوچ عوام قدرت سے گہری محبت رکھتے ہیں، ان کے دل پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں، اور قدرتی مناظر کی وسعت سے جڑے ہیں، جس کی جھلک ان کی شاعری، لوک ادب، اور فنی اظہار میں جابجا نظر آتی ہے۔

بلوچ ثقافت کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کا صوفیانہ اور انسان دوست پہلو ہے، جو اس کے لوک ادب اور طرزِ زندگی میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ ثقافت قدیم روایات اور جدید دنیا کے امتزاج کی بہترین مثال ہے، جو نہ صرف اپنی منفرد شناخت قائم رکھے ہوئے ہے بلکہ اپنے اندر جدت اور وسعت کی گنجائش بھی رکھتی ہے

2.10 لج و میار:

شرم و حیا کے لیے بلوچی میں لج جبکہ بلوچی روایات و اقدار کی پاسداری نہ کرنے کے عمل کو "میار" کہا جاتا ہے اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کوئی ایسا عمل نہ کیا جائے جو بلوچی روایات و اقدار کے منافی اور من حیث القوم بلوچ سماج کے لیے شرمندگی اور ذلت کا باعث بنتا ہو۔ لج و میار کا اصطلاح بلوچ سماج کے تمام سماجی، اخلاقی اور معاشرتی معاملات سمیت پورے بلوچ نظام حیات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ اصطلاح شرم و بے شرمی، ذمہ داری و غیر ذمہ داری، مصدقہ وجود اور غیر مصدقہ وجود کے درمیان واضح فرق و تفریق کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک مشہور بلوچی کہاوت ہے کہ "شئے لیز میں زیندءَ موت گہہ اِنت "ذلت کی زندگی سے بہتر ہے بندہ مر جائے ،یعنی ایسا کوئی غیر شائستہ ، نامناسب حرکت یا غیر اخلاقی عمل جو بدنامی اور بے شرمی کا باعث بنے تو ساری زندگی اس بے شرمی اور ذلت کا بوجھ اُٹھائے پھرنے سے بہتر ہے کہ بندہ اپنی زندگی سے ہی دستبردار ہو جائے۔ اسی طرح ایک اور بلوچی کہاوت ہے کہ "خدا بلوچءَ بے پردگ مکنت "یعنی خدا بلوچ کو بے پردہ اور شرمسار نہ کرے۔ اس کہاوت میں فرد کی بجائے پورے بلوچ سماج کو کسی بھی طرح کا غلط کام کرنے اور شرمندگی سے بچنے کی دعا کی گئی ہے۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور کہاوت بھی ہے کہ "مردم

بے آب مبات ''یعنی' خُدا انسان کو شرمندہ نہ کرے' روایتی بلوچ معاشرے میں ایک شخص کی سب سے بڑی توہین یہ ہے کہ اسے بے شرم کہا جائے کیونکہ بلوچ کے لیے سب سے قابل توقیر چیز اس کا وقار و احترام ہے۔ (Baluch 1977:39)

اسی طرح شرم وحیا کے حوالے سے ایک بلوچی کہاوت یہ بھی ہے کہ ''لاپ شہ چماں بُن ءَانت ''یعنی پیٹ، آنکھوں کے نیچے ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پیٹ یعنی بھوک کوئی چیز نہیں، آنکھیں یعنی حیا ہی سب کچھ ہے۔ بہت سے بلوچ کسی تقریب میں شرکت کرنے سے پہلے اس لیے گھر سے کچھ کھا کر جاتے کہ وہ وہاں زیادہ کھانا کھانے کی شرمندگی سے بچ سکیں۔ اسی طرح بلوچ معاشرے میں ''شگان ''یعنی طعنہ کو انتہائی معیوب خیال کیا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا داغ تصور ہوتا ہے جو نسلوں تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس حوالے سے بلوچی میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ ''مرگ یک روچءَ وشگان سد روچ''(Jan Muhammad 1982:100)یعنی مرنے کی اذیت اور تکلیف تو چند لمحوں کی ہوتی ہے۔ جبکہ شرمساری کی اذیت صدیوں تک جھیلنی پڑتی ہے۔ اسی لیے موت کی اذیت، شرمندگی کی اذیت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ الغرض بلوچ معاشرے کا تمام تر نظام اقدار اسی ''لجءمُیار'' کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ اس لیے بلوچ کہتے ہیں کہ ''بلوچ بوتگ گران اِنت ''یعنی بلوچ بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

2.11 بُردباری و وضع داری:

بلوچ معاشرے کا بنیادی اور اہم وصف ''اوپار'' یعنی برداشت، بُردباری اور وضع داری ہے جسے ''بلوچ ھانوادگی ''یعنی بلوچ متانت اور شائستگی بھی کہا جاتا ہے، بلوچ اپنے مزاج کے اعتبار سے آزاد طرز فکر کی حامل قوم ہے۔ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی تعصب اور تنگ نظری کی بجائے بلوچ لوگ باہمی ہم آہنگی، رواداری اور وضع داری پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کی سماجی، مذہبی اور معاشرتی تصورات و معاملات کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اس میں کسی قسم کی مداخلت کو غیر اخلاقی اور ناپسندیدہ عمل سمجھتے ہیں۔

2.12 مہرءُوفا:

بلوچ کہتے ہیں کہ ''مہر پہ بہا گپت نہ بیت ''یعنی پیسوں سے محبت خریدی نہیں جاسکتی۔ لیکن محبت کی قوت اور اس کے فسوں سے ہر چیز کو زیر کیا جاسکتا ہے، اپنی گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔ ایک مشہور بلوچی کہاوت ہے کہ ''کدحے

آپ بور، سد سال وفا بکن "یعنی اگر ایک شخص آپ کو ایک کٹورا پانی پلائے تو اس کے بدلے میں سو سال تک وفا کی جائے۔ بلوچی زبان کے نامور شاعر عطا شاد نے اس تصور کو یوں اُردو شاعری کا جامعہ پہنایا ہے۔

میری زمین پر ایک کٹورے پانی کی قیمت

سو سال وفا ہے

آؤ ہم بھی پیاس بجھائیں

زندگیوں کا سودا کر لیں

عام مشاہدہ یہ ہے کہ بلوچ عزت و احترام اور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں اگر انہیں محبت و احترام دیا جائے تو وہ اس کے بدلے میں جانیں نچھاور کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

2.13 قول و اقرار کی پاسداری:

بلوچ معاشرے میں بد عہدی اور وعدہ خلافی کو انتہائی معیوب اور ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ ایک مشہور بلوچی ضرب المثل ہے کہ "گُولاں بگا بول کن اَنت، عہد اں کچیمبک ورنت "یعنی بد عہدی اور وعدہ خلافی نیچ اور کم ظرف لوگوں کا کام ہے، جبکہ ایک باوقار انسان اپنے قول پر قائم رہتا ہے اسی طرح ایک اور کہاوت ہے کہ "ساہ بروَت، قول مہ روت" اس سے مراد یہ کہ قول کی پاسداری کی خاطر بھلے جان چلی جائے مگر وعدہ خلافی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ بلوچ زبان کی لغزش سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک کہاوت ہے کہ "زبان تئ باہوٹ آں "زبان میں تیری پناہ میں ہوں۔ یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ زبان کی لغزش کی وجہ سے کوئی غلط اور نامناسب بات منہ سے نکلے۔

2.14 بہادری:

بہادری اور شجاعت تمام انسانی معاشروں کا بنیادی اور نمایاں وصف ہے۔ جبکہ اس کے برعکس بُزدلی اور بے حمیتی کو انتہائی معیوب فعل سمجھا جاتا ہے۔ بلوچی میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ "لگوریں مردم ءَ زھم دی نہ ورنت" یعنی بزدل اور بے حمیت شخص پر تلوار کا وار بھی اثر نہیں کرتا۔ اس کہاوت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک بزدل شخص سے کسی بھی قسم کی توقع رکھنا فضول ہے۔

بلوچ معاشرے میں نہ صرف بہادری کو سراہا جاتا ہے بلکہ بہادر دشمن کو بھی انتہائی قدرواحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بلوچی زبان کے نامور رزمیہ شاعر رحم علی مری نے جہاں اپنی شاعری میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے بلوچ سورماؤں کی ہمت اور جرات کو خراج تحسین پیش کیا، وہیں پہ اُس نے انگریز سپاہیوں کی بھی تعریف و توصیف کی تھی، جو بلوچوں کے ساتھ بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ گدو مری نے بھی اپنی شاعری میں انگریز فوج کی بہادری اور نظم ونسق کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

انگریز سپاہ قابل تعریف ہے
ان کے جنگی قواعد اور نظم وضبط مثالی ہیں
وہ لڑائی کے طور طریقے جانتے ہیں
اُسے لڑنے پر قدرت حاصل ہے (نصیر 262:1979)

اسی طرح نفسک کے مقام پر برطانوی فوج اور مری بلوچوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کے اختتام پر جب انگریز سپہ سالار سر چارلس نیپئر میدان جنگ سے اپنے سپاہیوں کی لاشیں سمیٹ رہا تھا تو اسے کچھ سپاہیوں کے دونوں کلائیوں کو جوڑ کر قرمزی دھاگے لپٹے ہوئے نظر آئے۔ جب اس نے قرمزی دھاگوں کا سبب جاننا چاہا تو اسے بتایا گیا کہ یہ آپ کے وہ سپاہی ہیں جو بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے تو مری بلوچوں نے ان کی بہادری، جرأت اور حوصلے کے اعتراف میں ان کی کلائیوں پر قرمزی دھاگے لپیٹ لیے تاکہ یہ بہادر سپاہی ان دوسرے مرئے ہوئے بزدل سپاہیوں سے مختلف نظر آسکیں جو مرنے سے پہلے مر گئے تھے۔ (نصیر 253:1979)

اسی طرح دوسری طرف بلوچ معاشرے میں بُزدلی کو قابل نفرین عمل سمجھا جاتا ہے۔ بلوچ تاریخ میں گراں ناز نامی خاتون نے اپنے شوہر للئہ کو اس لیے بطور شوہر قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ گاؤں میں یہ غلط اطلاع آئی تھی کہ للئہ میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگ گیا ہے۔ حالانکہ وہ لڑائی کے دوران بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے شدید زخمی ہو گئے تھے۔ (بلوچ 19-16:1920)

بلوچ معاشرے میں بہادری کے ساتھ لڑ کر جان دینا موت کو شکست دینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے (بلوچ 83:1963) اور ایسی موت کو ایک باوقار زندگی کا خاتمہ خیال کیا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس بستر پر جان دینا ایک حقیر موت تصور کیا جاتا ہے۔ (Baluch 1977:39)

ایک بلوچی کہاوت ہے کہ 'قبراں کلمپوگ مان نیست، ماتی تنگویں، بچ اَنت، یعنی قبریں بیکار چیزوں کی مدفنیں نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ماؤں کے جگر گوشے دفن ہوتے ہیں یعنی موت حق ہے اس لیے موت سے خائف اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حوالے سے ایک اور مشہور بلوچی کہاوت ہے کہ "مرگ بد دُعا یے نہ انت "یعنی کسی کو یہ کہنا کہ خُدا کرے کہ آپ مر جائیں تو بلوچ کہتے ہیں کہ یہ کوئی بد دعا نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کو بہر حال کسی نہ کسی دن مرنا ہی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ انسان حقیر اور چھوٹی موت کی بجائے ایک باوقار اور بڑی موت سے دوچار ہو جائے۔ جسے بلوچ "موتکی موت "(ماتمی موت) کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی موت مرنا کہ جس کے باعث لوگ مدتوں اُس کے غم میں سوگوار رہیں اور دُکھ کا اظہار کرتے رہیں۔

حقیر موت کی بجائے بڑی موت کی تمنا کرنا شاید موت کا وہ شعور ہے جو انسان کو اپنے زوال سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور مرنے کے بعد زندہ رہنے کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کسی کی اصل زندگی تو اس کے مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یعنی دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ اُسے کتنا یاد کرتے ہیں کتنا احترام دیتے ہیں۔

بلوچ عام طور پر چوری چھپے دشمن پر وار نہیں کرتے اور وہ اس عمل کو بزدلی خیال کرتے ہیں۔ وہ باقاعدہ طور پر دشمن کو پیشگی اطلاع دے کر تیار رہنے اور لڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اسی طرح بلوچ معاشرے میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے قتل کو بھی بزدلی تصور کیا جاتا ہے۔ (JanMuhammad 1982:74-5) اس لیے لڑائیوں میں ان پر ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا تاہم اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچے، بوڑھے اور خواتین عام طور پر جنگوں میں کوئی سرگرم اور فعال کردار ادا کرنے کی قابل نہیں ہوتے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے انہیں جنگوں میں استثنٰی حاصل ہے۔ اسی طرح دوسری طرف جنگوں کے دوران خواتین یا کسی سیّد یا بزرگ شخص کے بیچ میں پڑنے سے جنگ کے روکنے کا عمل بھی شاید جینے کی خواہش کا ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہو ورنہ مرنے اور مارنے کے اس قبیح اور لامتناہی عمل کے نتیجے میں انسانی وجود اور زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس لیے سماجی اور ثقافتی سطح پر ایسی علامتیں اور حوالے تراشے گئے کہ زندگی اور موت کے درمیان کوئی تو ایسا حد فاصل بہر حال ہونا چاہیے جہاں اجتماعی موت کی عفریت سے بچا جا سکے۔

بہر حال بہادری اور دلیری کو کسی جنگ و جدل اور قتل و غارت سے نہ تو جوڑا سکتا ہے اور نہ ہی اسی کے لیے کسی قسم کا جواز فراہم کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں وسیع القلب، بامروّت، سخی اور درگزر کرنے والے لوگ ہی بہادر ہوتے ہیں اور بہادری کا تاج انہی کے سروں پر ہی سج سکتا ہے۔

2.15 باہوٹ:

بلوچ معاشرے میں "باہوٹ" یعنی کسی شخص کو پناہ یا تحفظ دینے کی رسم اور دستور شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اس دستور کے مطابق اگر کوئی شخص کسی مشکل یا خطرے کے پیش نظر کسی بلوچ کے ہاں جا کر پناہ لیتا ہے تو اسے نہ صرف ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے بلکہ اس کی دفاع کی خاطر اپنی جان نچھاور کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ (Baloch 1964:7) اس رسم و دوستور کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ کوئی عام شخص تو اپنی جگہ پر مشکل کا مارا ہوا اگر کوئی دشمن بھی کسی بلوچ کے ہاں پناہ لیتا ہے تو اسے بھی ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے بلوچوں کے علاوہ یہ رسم پشتونوں میں بھی موجود ہے۔ بلوچ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ پناہ میں آئے ہوئے شخص کا تحفظ کرنے میں ناکام رہے تو بلوچ تاریخ میں وہ ہمیشہ کے لیے معیوب اور معتوب ٹھہرائے گئے۔ ملا اسماعیل نامی ایک شاعر ایسے کرداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دشمن کو بُزدلی اور بے ہمتی کا طعنہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

تم تو بالکل شمس الدین اور اللہ یار بنے بیٹھے ہو
تم تو باجو باالخیر سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ گئے ہو
بدنامی اور رسوائی کا یہ داغ
سات پشتوں تک تیرے ساتھ رہے گا (نصیر 109:1979)

شمس الدین، اللہ یار اور باجو باالخیر بلوچ تاریخ میں ایسے کردار ہیں کہ ان کی موجودگی میں ان کے پناہ گیر قتل کیئے گئے لیکن وہ اپنے پناہ گیروں کو حملہ آوروں سے بچانے میں ناکام رہے۔ اس لئے بلوچ تاریخ میں وہ ہمیشہ کے لئے مطعون ٹھہرے۔

2.16 بلوچ سماج میں عورت کا مقام و مرتبت:

بلوچ سماج میں خواتین کے وقار اور احترام اور اس کے سماجی کردار کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ شوہر کی عدم

موجودگی میں وہ گھر کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ وہ زرعی اور دوسری سرگرمیوں میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے۔ اگرچہ بلوچ سماج میں عورت کا رویہ اور ان کا طرز عمل فرمانبرداری اور تابع داری کی عکاسی کرتی ہے تاہم یہ تابع داری کسی غلامی کی دلالت نہیں کرتی۔(JanMuhmmad 1982:74-75)

بہر حال بلوچ معاشرے میں عورت کا کردار ہمیشہ سے مثالی اور غیر معمولی رہا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تاریخی طور پر بلوچ خواتین نے اپنی سماجی منصب اور کردار کے اعتبار سے مردوں سے کہیں زیادہ ذمہ داری اور بڑے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلوچ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جہاں عورت نے نہ صرف اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے کردار سے انصاف کیا بلکہ اپنے وجود کے معتبر ہونے پر تصدیق کی مہر بھی ثبت کی۔ گراں ناز نامی خاتون (جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے) نے اپنے شوہر للئہ کو اس لیے قبول کرنے سے انکار کیا تھا کیونکہ گاؤں میں یہ غلط اطلاع آئی تھی کہ ان کا شوہر میدان جنگ سے بزدلوں کی طرح پیٹھ دکھا کر بھاگ گیا ہے حالانکہ للئہ جنگ میں بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے شدید زخمی ہو گئے تھے لیکن گراں ناز نے اس جھوٹی خبر کی تصدیق کرنے اور صورتحال کو مکمل طور پر سمجھنے اور جاننے سے پیشتر یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی بزدل اور بے حمیت شخص اس کا شوہر نہیں ہو سکتا۔ اس حوالے سے گراں ناز اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

جب جنگ شروع ہوئی تو میں
اپنی سہیلیوں سے تمہاری بہادری کا تذکرہ کر کے
فخر محسوس کرتی رہی
مگر تمہیں لڑائی کے وقت حسیناؤں کی ادائیں
اور آرام دہ گھر یاد آتے رہے
آج کے بعد تم میرے لئے شوہر کی بجائے
میرے بیٹے کی مانند ہو
جسے میں نے دودھ پلا کر پالا ہو

(بلوچ1970:46-47، میمن 1971:389)

اسی طرح گزوچنو نامی ایک شخص نے بلوچی روایات و اقدار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بھائی کے قاتلوں سے صلح کر لی لیکن اس کی سوتیلی بہن نے ایک کمزور عورت ہونے کے باوجود بھی قاتلوں میں سے ایک کو قتل

کر کے اپنے بھائی کا انتقام لیا تھا(نصیر 109:1979) دودا گورگیج جو کہ ایک قبیلے کا سربراہ تھا ان کے ہاں سمی نامی ایک مالدار خاتون نے پناہ لے رکھی تھی کہ کچھ قبائلی دشمن اس کے مال مویشی چرا کر لے گئے۔ دودا گورگیج کی ماں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے پناہ میں آئی ہوئی خاتون کے جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اپنے بیٹے دودا گورگیج کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

میں پورے نو ماہ تک
تجھے اپنی کوکھ میں پالتی رہی
تجھے دو سال تک بلوچ ماں کا دودھ پلاتی رہی
میری ممتا کا دودھ تجھ پر حرام
جب تک کہ تم
سمی کے چُرائی گئیں گائیں واپس نہیں لاتے
یا اسی تگ و دو میں اپنی جان قربان نہیں کرتے

(نصیر:207:1979)

اسی طرح ایک دیرینہ قبائلی دشمنی کے باعث مخالفین جب اسحاق رند نامی شخص کو قتل کر کے واپس اپنے گاؤں جا رہے تھے تو راستہ میں رات پڑ جانے کے باعث انہیں ایک گدان(خیمہ) نظر آیا تو انہوں نے وہاں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر میں مرد نہ ہونے کے باعث ایک خاتون نے ان کا استقبال کیا۔ بلوچی رسم و رواج کے مطابق جب خاتون نے اُن سے "بلوچی حال احوال پوچھا" تو انہوں نے بتایا کہ اسحاق رند نامی شخص کے ساتھ ہماری کوئی پرانی دشمنی تھی۔ ہم اس کو قتل کر کے واپس اپنے گھر جا رہے تھے کہ ہمیں رات پڑ گئی تو ہم نے آپ کے ہاں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جواباً خاتون نے ان کو بتایا کہ تم لوگ جس اسحاق رند کو قتل کر کے میرے گھر مہمان بن کر آئے ہو، میں اُسی اسحاق رند کی بہن ہوں اور یہاں بیاہی گئی ہوں۔ یہ سن کر وہ قاتل سکتے میں گر گئے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو خاتون نے ان سے کہا تم لوگوں کو اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے تم لوگ آج مہمان بن کر میرے گھر آئے ہو مہمانوں کو اللہ لے آئے، دشمنیاں تو چلتی رہیں گی۔ اس کے لیے تو بڑی عمر پڑی ہے۔ یہ صرف چند خواتین کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ بلا مبالغہ بلوچ سماج میں عورت کا وجود اور اس کا کردار ہمیشہ سے ہی بابرکت اور مقدس رہا ہے۔

تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ بلوچ معاشرے میں عورت کو اس احترام اور تکریم سے نہیں نَوازا گیا جس غیر معمولی تکریم اور احترام کی وہ مستحق تھی اور ہے۔ بلوچ معاشرے کی یہ قابل ستائش اقدار و اوصاف اپنی جگہ پر، تاہم یہ بھی نہیں کہ بلوچ معاشرہ کوئی دودھ کا دھلا ہوا معاشرہ ہے کیونکہ کوئی بھی انسانی معاشرہ ایسا کوئی مثالی نظام وضع نہیں کر سکتا کہ جس میں کوئی بھی خامی اور کمزوری نہ ہو۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بلوچ معاشرہ بھی خامیوں اور کمزوریوں سے مبّرا نہیں ہے مثلاً قدیم بلوچ معاشرہ میں بیٹے کی پیدائش پر نہ صرف بندوقیں چلا چلا کر مسرت اور خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا بلکہ بیٹے کی پیدائش کو جشن کے طور پر منایا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قبائلی معاشروں میں خاندان کی تحفظ کی خاطر مردوں اور افرادی قوت کی ضرورت ہوتی تھی اور جس خاندان کے بیٹے، بھائی زیادہ ہوتے اور برادریاں بڑی ہوتی تھیں، وہ خاندان زیادہ طاقت ور ہوتا تھا۔ اسی طرح خواتین کی نسبت مردوں کی وفات پر زیادہ سوگ منانے اور تعزیت و پرسہ کا اہتمام دیکھنے کو ملتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف سرداروں اور قبیلوں کے نام پر بنی ہوئی قبائلی سرحدیں، رکاوٹیں اور دشمنیاں، اجتماعی سزائیں اور قتل و غارت، آس ءُ آپ جیسے غیر انسانی معاملات بلوچ سماج سے وابستہ رہی ہیں۔

2.16.1 آس ءَ جنگ:

دہکتے انگاروں کی بیس پچیس فٹ کی لمبی چری جہاں ملزم کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے گزارا جاتا ہے۔

2.16.2 آپ ءَ جنگ:

گہرے پانی میں ملزم کو اتارا جاتا ہے جہاں اگر وہ دو تین منٹ تک پانی کی تہہ میں رہ لیتا ہے تو اسے بے گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ اگر وہ پانی کی تہہ میں بیٹھے رہنے کی بجائے پانی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے تو اسے ملزم تصور کیا جاتا ہے۔

جن کا کسی صورت میں دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ قدیم بلوچ سماج میں کسی حد تک عورت کی حیثیت اور اس کے وقار و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔ تاہم درمیانہ عہد میں بلوچ عورت کو عدم برابری، صنفی امتیاز اور بہت سے تکلیف دہ سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ علم و آگہی کے اس موجودہ عہد میں اگرچہ بلوچ عورت کی سماجی زندگی نسبتاً بہتر نظر آتی ہے۔ تاہم بلوچ عورت کو مزید احترام و تکریم، سماجی برابری اور مناسب مقام و مرتبت کی ضرورت ہے۔

خود آزمائی

1۔ بلوچ معاشرے میں میڑ مرکہ کی کیا اہمیت ہے، بیان کریں۔

2۔ بلوچ تہذیب و ثقافت کے تہذیبی پس منظر کی وضاحت کریں۔

3۔ بلوچ سماج میں عورت کے مقام و مرتبے کا محاکمہ کریں۔

4۔ بلوچی یا بلوچی دود کیا ہے؟ روشنی ڈالیں۔

حوالہ جات

1. Baloch, Mir KhudaBux Bijarani Marri 1964: The Balochis through centers, History versus legend. Islamia Electric press, Quetta.
2. Baluch, M.S . Khan 1977, 2010: Literary History of the Balochis, Vol 1 Balochi Academy Quetta.
3. CDA Black, Jeremy and others (eds) 2000:A concise Dictionary of Akkadian 2nd (corrected) printing, Harrasowitz verlag. Wiesbaden.
4. Didier, Aurore and Mution, Benjamin 2015:| The kech-Makran region in Protohistoric poetry resources from Balochistan, Museum of Islamic Art, Program museum am Kufergaben 5, 10117 Berlin. PP. 297-333
5. Jan Muhammad 1982: The Baloch cultural Heritage Royal book co. Karachi
6. Jarrige, Jean-Francois 2008: Mehrgarh Neolithic, Praghara No 18: 135-54. Journal of the U.P state Archaeolgoy deparment, Lucknow.
7. Possehl, G.L 1996: Meluhha In: Reade Julian (ed) the Indian Ocean in antiquity kegan paul international, London P.P 133-208
8. Rzehak, Lutz 2011: Doing Pashto Afghanistan Analysts Network pp1-21 www.aan-afghanistan.org
9. Shapiro, Harry L. 1957: Aspects of Culture, Rutgers, The state University U.S.A
10. Witzel, Michael 1999: Substrate languages in old Indo-Aryan (Regredic, Middle and Late Vedic) Electornic Journal of Vedic Studies (EJVS) 5-1, pp1-67

11۔ بلوچ، بشیر احمد 1970: للہ وگراں ناز، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ
12۔ بلوچ، محمد سردار خان، 1963: چاکر اعظم، بزم ثقافت کوئٹہ (اُردو ترتیب: عبدالغفار ندیم)
13۔ میمن، عبدالمجید 1971: بلوچی ادب (مشمولہ) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
14۔ نصیر، میر گل خان 1979: بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ
15۔ نصیر، میر گل خان 1971: بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

یونٹ نمبر:3

بلوچی لوک ادب

تحریر:ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل:ڈاکٹر عبدالواجد تبسم

فہرست

یونٹ کا تعارف		47
مقاصد		47
3	بلوچی لوک ادب	48
3.1	بلوچی لوک شاعری	48
3.2	سپت	48
3.3	لولی	49
3.4	سوت	50
3.5	ہالو	51
3.6	لاڑوگ	53
3.7	زہیروک	54
3.8	ڈیہی	55
3.9	امبا	56
3.10	لیکو	56
3.11	دستانغ	57
3.12	موتک	58
	خود آزمائی	58

یونٹ کا تعارف

بلوچی لوک ادب بلوچستان کی ثقافت، روایات، اور اجتماعی شعور کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے۔ یہ ادب نہ صرف بلوچی زبان اور تہذیب کی تاریخ کا آئینہ دار ہے بلکہ انسانی جذبات، تجربات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی بھی کرتا ہے۔ لوک ادب عوام کی تخلیقی صلاحیتوں، ان کے جذبات، عقائد، اور معاشرتی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس میں وہ داستانیں، نظمیں، اور گیت شامل ہوتے ہیں جو نسل در نسل زبانی روایت کے ذریعے منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اس یونٹ میں بلوچی لوک شاعری کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں لولی، دستانگ، لیلڑی، سوت، مودگ، زیروک، امبا، لیکو اور دیگر اصنافِ شامل ہیں۔ ہر صنف کا اپنا ایک منفرد انداز، موضوع، اور اسلوب ہے، جو بلوچی ثقافت کی گہرائی اور خوبصورتی کو اجاگر کرتا ہے۔ ان اصناف میں بلوچ معاشرت، عقائد اور روایات کا رنگ جھلکتا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو مکمل کرنے کے بعد طلبہ!

1۔ لوک ادب کی تعریف، اس کی اہمیت اور اس کے ثقافتی کردار کو سمجھ سکیں گے۔

2۔ بلوچی لوک شاعری کی مختلف اصناف جیسے لولی، دستانگ، لیلڑی، سوت مودگ، زہیروک، امبا اور دیگر اصناف کے اسلوب اور انداز سے آگاہی حاصل کریں گے۔

3۔ بلوچی لوک شاعری کے ذریعے بلوچ ثقافت، روایات اور معاشرتی اقدار کی عکاسی کو سمجھ سکیں گے۔

4۔ بلوچی لوک ادب کی تخلیقی اور جمالیاتی خصوصیات کو واضح کر سکیں۔

3۔ بلوچی لوک ادب

3.1 بلوچی لوک شاعری:

لوک ادب اور لوک شاعری ہماری ثقافت، تاریخ اور روایات کی ترجمان ہیں۔ یہ ادب نسل در نسل زبانی روایت کے طور پر منتقل ہوتا رہا ہے اور اس میں عوامی زندگی کے تجربات، مختلف خیالات اور جذبات کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ لوک ادب میں کہانیاں، قصے، محاورے اور ضرب الامثال شامل ہیں جو عام لوگوں کی زندگی ان کے مسائل، خوشیاں، دکھ اور مقامی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ لوک ادب میں کسی مخصوص مصنف کا تعین نہیں ہوتا بلکہ یہ معاشرے کی اجتماعی تخلیق ہوتی ہے۔ ہر علاقے اور قوم کا اپنا لوک ادب ہوتا ہے جو ان کے ذہن، رسم و رواج اور مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ لوک شاعری عوامی شاعری ہے جس میں عوامی جذبات اور احساسات کو منظوم شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ شاعری گیتوں اور مختلف شعری اصناف میں ہوتی ہے جو شادی بیاہ، میلوں، ٹھیلوں اور دیگر خوشی یا غمی کے موقع پر گائی جاتی ہیں۔ اس میں وطن سے محبت، فطرت کی خوبصورتی اور معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور زبان سادہ، استعارے مقامی اور موضوعات عام ہوتے ہیں تاکہ عام لوگ اسے سمجھ سکیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یہ ایک ایسا ورثہ ہے جو صدیوں سے مستعمل ہے اور نت نئے رنگوں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔

بلوچی لوک شاعری میں اپنی مٹی کی خوشبو، اپنے خون کا رنگ، اپنی زبان کی مٹھاس، اپنے پھلوں کی چاشنی، پہاڑوں کی شان، اپنی ندیوں کی روانی، اپنی دھرتی کی خوبصورتی، اپنے کسان اور مزدوروں کی محنت کی روشنی، بلوچی پنگوڑے کی آواز، چاندنی، نغمے، بلوچوں کی بہادری کے قصے، تاریخی واقعات، دکھ سکھ کی کہانیاں، بحر بلوچ کی لہروں کا شور، بلوچی ساز، موسیقی، آپس کی چپقلشیں، بلوچوں کی غیرت وغیرہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مکمل بلوچیت موجود ہے۔ دیگر پاکستانی زبانوں کی طرح بلوچی لوک شاعری بھی مختلف اصناف پر مشتمل ہے جن میں کچھ درج ذیل ہیں۔

3.2 سِپت:

سپت کا مطلب تعریف ہے یہ عربی زبان کے لفظ صفت سے ماخوذ ہے۔ بلوچی میں سپت کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم وہ ہے جو بچے کی پیدائش کے وقت گایا جاتا ہے، پیدائش کے دن سے لے کر نام رکھنے کی رسم "ششگان" کے دن

تک روزانہ رات کو محفل سجا کر گایا جاتا ہے۔ عزیز و اقارب خواتین کے ساتھ ہمسائے میں رہنے والی خواتین بھی اس محفل میں شامل ہوتی ہیں جو زچہ و بچہ کی صحت یابی، عمر درازی بچے کے روشن مستقبل اور بچے سے توقعات کے دعائیہ کلمات گاتی ہیں۔ دوسری قسم کی صفت میں خداوند کریم کی شان بیان کی جاتی ہے۔ ان سب میں اللہ تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ، اولیا اکرام اور بزرگان کی تعریف، کائنات کی خوبصورتی، قدرت کے حسین نظاروں کے ذکر کے ساتھ ساتھ پنت و نصحیت شامل ہیں۔

لا قا! من تئ باہوٹاں
کپوک ءِ منی پاد بکن
یعنی لعل قلندر! میں تیری پناہ میں ہوں
زچہ کو میرے صحت یاب کر
سپت ءُ ثناء انت
درست لائق ہدا انت
یعنی صفت و ثناء ہے
سب خدا کے واسطے
قربان اوں واجہ ھدا تئ
مارا نبو تگ ننل ءِ گمان
اللہ ءِ داتگ ناگمان
یعنی قربان ہوں اے خداوند میں تیرے
ہمیں بچے کی پیدائش کا گمان نہ تھا
خداوند تو نے اچانک جھولی بھر دی

3.3 لولی:

لولی یا لوری یا انگریزی میں lullaby ایک ایسا لوک گیت ہے جسے مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لیے گاتی ہیں۔ یہ گیت نرم اور پر سکون دھنوں پر مبنی ہوتا ہے۔ بلوچی میں بھی یہ گیت اسی معنوں میں مستعمل ہے جس میں

محبت، دعا اور خیر خواہی کے جذبات کے ساتھ ساتھ بچے کے لیے اچھی زندگی، صحت، خوشی اور کامیابی کی دُعائیں شامل ہیں۔ بلوچی لوریوں میں نہ صرف ماں کی ممتا ہوتی ہے، بلکہ ماں اپنے دودھ پیتے بچوں کو ان کے ذریعے بلوچ معاشرے کے ماضی، حال اور مستقبل کا درس بھی دیتی ہے، ان اندھیروں میں بلوچ ماں کی لوری ہوا کے جھونکے کے ساتھ ماضی اور حال کے جھولے میں آنے والی داستانیں بھی ہیں اس میں ماں یہ ساری باتیں بہت آرام دہ اور ہلکے جھولوں کے دوران میٹھی اور نرم آواز سے بچے کو بتاتی جاتی ہے۔

لوری دیتا ہوں اپنے لعل کو
سوتارہ! میرے بچے سوتارہ
سوتارہ کہ تجھے نیند پھول کی طرح کھلا دے
سوتارہ میرے بچے کہ بے خوابی تیری نشو و نما روک دے گی
بڑھ اور پھل پھول
تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے
تیری ٹہنی پہ کبھی کوئی خار نہ پھوٹے
میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور
تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو کرے گا
ہمارے دل کو تسلی دے گا
سوتارہ میرے بچے سوتارہ میرے بچے سوتارہ

3.4 سوت:

سوت یعنی گیت بلوچی لوک ادب کی ایک مشہور اور قدیم صنف ہے۔ گیت کی نوعیت کسی نوعیت کی ہو اس کے اظہار میں ایک سادگی اور ایک سلاست کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جو بلوچ ثقافت تاریخ اور جذبات کی عکاسی کرتا ہے اس میں محبت، جدائی، جنگ، پیار، قومی تشخص کے موضوعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ سوت بلوچستان کے قریباً سبھی علاقوں میں رائج ہے اس صنف سے متعلقہ گیتوں کی خصوصیات یہ ہے کہ یہ شادی بیاہ اور دیگر پر مسرت تقاریب میں

گائے جاتے ہیں۔ ان میں مشترکہ احساسات کا پر خلوص اظہار اس صنف کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بڑی وجہ ہے سوت میں مرد اور عورت ناچ اور تالیوں کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔

بیامنی زبادمال	آیارزبادافشاں
نندے خراسان	توزیب خراسان ہے
بے تومیاتان	اس ہجر سے موت آسان ہے
بیامنی زبادمال!	آیارزبادافشاں
چماں داراں	رکھے تجھے پلکوں میں
بیامنی زبادمال!	آیارزبادافشاں
کنڈیں ماپر	گیسوترے سنبل ہیں
کاکدیں رکاں	ہونٹ ترے مثل گل
بیامنی زبادمال!	آیارزبادافشاں
مرواردیں دنتان	موتی جیسے ترے دندان
زیباؤشرے	توحُسن کی مورت ہے
کولیگ باتاں	تجھ پر دل وجاں قرباں

3.5 ہالو:

بلوچی لوک ادب کی قدیم ترین شعری صنف ہے جو کہ مسرت اور شادمانیوں کے دوران ایک مخصوص وقت پر گایا جاتا ہے۔ عزیز و اقارب، بزرگ خواتین، دلہا اور دلہن کی بلائیں اپنے سر لیتی ہیں۔ یہ شادی، منگنی اور دیگر خوشی کی تقریبات میں کہی جاتی ہے۔ شادی کے تقریب کے دوران دلہن کو شادی کا جوڑا پہنانے، سجانے اور مہندی لگانے کی رسم ہو یا پھر دولہے کو نکاح سے قبل نہلا دھلا کر تیار کرنے کا مرحلہ، اس دوران ہالو خوش الہانی کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ ہالو رباب، سرینده، نگرہ اور دموره جیسے سازوں کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ لیکن جب ساز دستیاب نہ ہوں تو اس کے بغیر بھی گایا جاتا ہے۔ اس میں دلہن کی خوبصورتی، سگھڑپن اور داماد کی بہادری، نشانہ بازی، گھڑ سواری و دیگر صفات کی توصیف کی جاتی ہے۔ ہالو میں دلہا دلہن کی آئندہ زندگی کے لئے خواہشات اور دعائیں بھی شامل ہیں۔

ہلوہالو کن ات وشیں ہلوئیں

ہلوہالو کن ات میرءَ منیءَ

ہلوہالو کن ات احتہ چہ دورءَ

ہلوہالو کن ات چمانی نورءَ

ہلوہالو کن ات میرءَ منی!

ہلوہالو کن ات میرءَ؛ پلینءَ

ہلوہالو کن ات آپُل گدینءَ

ہلوہالو کن ات میرءَ منی

ہلوہالو کن ات شیریں مزارءَ

ہلوہالو کن ات دریادلءَرا

ہلوہالو کن ات شاہین بلوچان

ہلوہالو کن ات اے ماہءَرُوچان

بلوہالو کن ات میرءَ منیءَ

یعنی

ہلوہالو بناہے میرادلہا!

ہلوہالو خوشی کے گیت گاؤ

ہلوہالو بناہے میرادلہا!

بہت ہی دور سے آیاہے

سبھی کی آنکھ کا تاراہے

ہلوہالو بناہے میرادلہا,!

سجاہے پھول کا ملبوس کتنا

مقدر ناز کرتاہے کسی کا

ہلوہالو بنا ہے میرا دلہا!
مبارک اس بہادر جری کو
مبارک میر کی دریا دلی کو
ہلوہالو بنا ہے میرا دلہا!
مبارک اس کی غیرت کو حیا کو
سلامت باد! اے شاہ بلوچاں
سلامت باد! اے مہر درخشاں
ہلوہالو بنا ہے میرا دلہا

3.6 لاڑوگ:

لاڑو، لئی لڑو، لاڑوگ بھی شادی و خوشی کے موقع پر گاتے ہیں جس میں ہالو کی طرح ان گیتوں میں لڑے، لاڑے، لاڑ، لاڑو وغیرہ الفاظ کی تکرار رہتی ہے اس لیے اس صنف کا نام لاڑو، لئیلڑو یا لاڑوک پڑ گیا۔ یہ سوت کے بہت قریب ہے۔ اس صنف کی شاعری میں عورتیں ہوتی ہیں۔ وہی اسے تخلیق کرتی ہیں اور وہی اسے گاتی ہیں۔ یہ بہت ہی پر تفریح صنف ہے جو شادی بیاہ میں، جشن میں، اکٹھ میں اور مختلف تقریبات میں گایا جاتا ہے۔

اے گل نو بہار آ بھی جا
اے در شاہوار آ بھی جا
لیلڑے لیلڑے لڑے لاڑے
آمری حور عدن نخلستان
تیری دوری بنی ہے دوزخ جاں
لیلڑے لیلڑے لڑے لاڑے
سر سے آنچل ذرا سرکا دے
ان گھنے گیسوؤں کو بکھرا دے
دل پریشان بھری بہار میں ہے

3.7 زہیر وک:

زہیر وک کو زہیر گ، زہیر ک یا زئروک بھی کہا جاتا ہے۔ زہیر کے معنی ہیں یاد۔ اس لیے اس صنف میں عام طور پر انتظار ہجر و فراق وغیرہ کے مضامین کا بیان ہوتا ہے۔ زہیر وک عام لوک گیتوں سے قدرے مختلف ہے۔ ''زہیر'' یاد کو کہتے ہیں اور انتہائی نرم دلی کو بھی کہتے ہیں۔ کسی قریب ترین ہستی کو یاد کرنے کی عمیق ترین کیفیت کو زہیر وک کہتے ہیں۔ اس کیفیت کے شعری اظہار کو بھی زہیر وک کہتے ہیں۔ اس صنف میں عاشق اپنی محبوبہ میں وصال کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ جس میں جدائی کی شدت، محبت کا جوش اور جذباتی کیفیت کو نمایاں انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ زہیر وک کی زبان نہایت سادہ اور تاثیر سے بھرتی ہوئی ہے۔ اس کے اشعار مختصراً مگر بامعنی ہوتے ہیں اور خاص کر جب چرواہے اپنے اپنے مویشیوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں تو وہ زہیر وک گاتے ہیں جو ایک پر سکون اور درد بھری موسیقی کی فضا ہوتی ہے۔

اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے

بچھڑے ہوئے من میت ایک سال گیا بیت
تو آئے نہ آئے لیکن تو کہاں ہے
تو مجھ سے ملی تھی پنگھٹ پہ اکیلی

اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے

رخ اونٹ کا میرے سورج کی طرف ہے
یہ قافلہ اور دھوپ اس دل میں تیر اروپ

اے سبز کبوتر مرا پیغام سنا دے

3.8 ڈیہی:

ڈیہی مشرقی بلوچستان کا مقبول ترین لوک گیت ہے۔ ڈیہی میں عشق و محبت کے بیانات، دوری کی کیفیات، عزیزو اقارب کی یاد، فتح کی خوشیوں، شکست کے غم، بہادری پہ فخر، خوش آئند مستقبل کے خواب، وطن سے پیار، طبقاتی کشمکش، مفلسی اور ناداری اور استحصال کے مصائب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کی شاعری میں ہجر و فراق اور وصال کی کیفیات کو انتہائی نرمی اور دلکش دھن کے ساتھ ہر عام و خاص، پیر و جوان، عاشق اور مرد و زن کہتے بھی ہیں اور گاتے بھی ہیں۔ یہ انتظار کی مہلک کیفیات اور ملاقات و وصل کے جلا ڈالنے والے مگر سکون آور لمحوں کے جذبات کے اظہار کی بے مثل صورت ہوتی ہے۔

آجا میری جان

اے میری جان آ کہ تیرے بغیر
زندگی بے قرار رہتی ہے
موت اچھی ہے ایسے جینے سے
ہجر کے تلخ گھونٹ پینے سے
اے مری جان آ کہ تیرے بغیر
زندگی بے قرار رہتی ہے
عہد فرداں پہ یوں نہ ٹال
ڈس نہ جائے غمِ وصال مجھے
راہ میں تیری فرش راہ بنوں
دل مضطر رہوں نگاہ بنوں
اے میری جان آ کہ تیرے بغیر
زندگی بے قرار رہتی ہے

3.9 امبا:

سونمیانی سے لے کر چاہ بہار تک کی طویل ساحلی پٹی پر آباد اکثر بلوچوں کا گذر بسر ماہی گیری پر ہے۔ یہ علاقہ قدیم سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں سے مختلف علاقوں اور ملکوں کے ساتھ تجارت ہوا کرتی تھی۔ پرتگیزیوں کے خلاف جنگ کے دوران حمل و جیئند اسی سمندر سے گرفتار ہوئے۔ اس کے علاوہ یہ ساحل لاتعداد سیاح، مورخین، محققین کی گذرگاہ رہی ہے۔ اسی ساحلی مٹی پر آباد بلوچ ماہی گیروں کا لوک گیت "امبا" ہے۔ جب محنت کش ماہی گیر اپنے ساتھیوں سمیت سمندر کی لہروں میں اترتے ہیں تو امبا گاتے ہیں۔ جو ان کی محنت کی عظمت کے نشان کو واضح کرتا ہے۔ یہ گیت ان کے جذبوں کو جوان کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ہفتوں اور مہینوں تک سمندر میں رزق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جہاں پر گھر سے دوری کے دوران تنہائی کے لمحوں میں سمندر کی لہروں کے ردھم میں اپنا گیت الاپ کر کے نہ صرف اپنا اکیلا پن دور کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ہمت بھی بڑھاتے ہیں۔ کورس کے انداز میں گیت گانے سے خاموشی ٹوٹتی ہے ناخدا (بادبان) ایک مصرعہ کہتا ہے اور اس کے ہمراہ دوسرا مصرعہ بول دیتے ہیں۔ یوں امبا سمندر کے لہروں کی آواز کے ساتھ مچھیروں کے سُریلی بولی ہے۔

بادبان	ملکہ محل میں ہے
ہمراہی	آرام چاہتی ہے
بادبان	ہاتھ نہ ہلانا
ہمراہی	خود بیدار ہو گی
بادبان	دلبر محل میں ہے
ہمراہی	آرام چاہتی ہے

3.10 لیکو:

لیکو یا لئیکو بلوچی لوک شاعری کی ایک اور خوبصورت صنف ہے۔ یہ گیت شتربانوں، ساربانوں اور چرواہوں میں زیادہ مقبول ہے اور خاران اس گیت کا مرکز کہلاتا ہے۔ تاہم یہی گیت افغانستان اور ایران میں آباد بلوچوں میں بھی خاصہ مقبول ہے۔ یہ گیت عموماً مسافرت کے کرب، جدائی کے دکھ اور وصال کی خوشی بیان کرتا ہے۔ اس میں مال

مویشی یعنی بھیڑ و بکریوں کا ذکر بھی ہوتا ہے تو پہاڑوں، بیابانوں، چراگاہوں میدانوں کی منظر کشی بھی۔ یہ صنف زہیروک کے ساتھ کہیں کہیں مماثلت رکھتی ہے لیکن اس کی دھن اسے زہیروک سے الگ کرتی ہے۔ یہ گیت اکثر و بیشتر دونلی یا سروز کے ساتھ گایا جاتا ہے۔

ماہ جان

آنکھیں ہیں "خمار" آلود

مجھ کو اللہ پر بھروسہ ہے

دل میرا پیار میں ہے آسودہ

زندگی حادثہ ہے کیا کیجیے

کاش یہ عہد استوار رہے

اپنا رومال تحفتہ دے

تاکہ یہ یادگار رہے

تیرا رومال ہاتھوں کا

تیری آنکھوں کا

تیرے ہونٹوں کا

سارا جادو سمٹ لائے گا

3.11 دستانغ:

اس کو دستانگ بھی کہا جاتا ہے یہ طویل بھی ہوتا ہے اور مختصر بھی۔ دستانغ شعری انداز میں ساز کے ذریعے بیانیہ کہانی کو کہا جاتا ہے۔ لوک ادب کی یہ صنف مشرقی بلوچستان میں کوہ سلیمان کے حدود میں آباد مری، بگٹی، بزدار، اور کھیتران قبائل کے ساتھ ساتھ وہاں پر آباد دیگر بلوچ قبائل میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ نڑوئر کی خوبصورت آواز ہو یا سروز اور دمبورہ کے دلکش تار جب بھی کوئی محفل سجتی ہے تو دستانغ خود بخود رواں ہو جاتی ہے۔ اس میں قدیم تاریخ ، قبائلی جنگوں اور معرکہ آرائیوں کے احوال، جواں مردی اور بزدلی کے قصے، عشقیہ داستانیں، سرگزشتیں، محبوب کی خوبیاں اور بے وفائیاں وغیرہ سب شعری انداز میں گا کر بیان کی جاتی ہیں۔ شمشیر زنی، گھڑ سواری، بہادری، ہمت،

قوت، مہمان نوازی اور بلوچی ضابطہ اخلاق کا درس بھی دستانغ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ ان علاقوں میں آباد اقوام میں اپنی تاریخ سے آشنائی اور رغبت کا سب سے آسان ذریعہ کہلاتا ہے۔

3.12 موتک:

موتک کو مودگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ موت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سوگ۔ اس لیے یہ کسی شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے پر رنج و غم کا اظہار یہ ہے۔ یہ بچھڑنے والے کے لیے ماتمی شاعری ہے جو روتے ہوئے گا گا کر سنائی جاتی ہے۔

میں بڑا بد بخت ہوں
میرے نصیب اور قسمت نے جو حصہ حاصل کی
اُسے سیمرغ نے بھی نہیں بدلہ
مُلانے بھی نہیں بدلہ
بخت نے مجھے آدھی راہ میں دھوکہ دیا
میری چارپائی کی پٹی ٹوٹ گئی
ہائے رے نصیب ہائے رے میری قسمت

خود آزمائی

1۔ لولی اور دستانگ میں کیا فرق ہے؟ بیان کیجیے۔
2۔ لیلڑی اور سوت کی صنف بلوچی معاشرت میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ وضاحت کریں۔
3۔ مودگ اور زیروک کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟ روشنی ڈالیں۔
4۔ امبا اور لیکو کے موضوعات کیا ہیں اور یہ بلوچ روایات کو کس طرح ظاہر کرتی ہیں؟
5۔ بلوچی لوک شاعری سے بلوچی ثقافت اور روایت کے کون کون سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں؟

یونٹ نمبر:4

رومانوی کہانیاں

تحریر: محمد پناہ بلوچ
نظر ثانی: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر حاکم علی برڑو

فہرست

یونٹ کا تعارف		61
مقاصد		61
4	رومانوی کہانیاں	62
4.1	ہانی وشیئے مُرید	63
4.2	بیبرگ و گراناز	67
4.3	شہداد و مہناز	69
4.4	کِیّا و صدو	73
4.5	حمل و ماہ گنج:	77
4.6	عزت و مہرک	80
	خود آزمائی	84

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ ! اس یونٹ میں آپ بلوچی ادب کی ان شاہکار رومانوی داستانوں کا مطالعہ کریں گے جو بلوچ تہذیب و ثقافت کا حسین آئینہ ہیں۔ یہ کہانیاں محبت، وفاداری، قربانی، اور انسانی جذبات کے مختلف رنگوں کے ساتھ بلوچ معاشرت کی قبائلی زندگی، روایات، اور اقدار کی عکاسی کرتی ہیں۔ آپ "ہانی و شسئے مُرید"، "بیبرگ و گرانا ز"، "شہداد و مہناز"، "کیّاو صدو"، "حمل وماہ گنج"، "عزت و مہرک" جیسی لازوال داستانوں کے ذریعے بلوچی ادب کی رومانوی روایت اور ان قصوں میں پنہاں بہادری، عزت، اور محبت کے جذبات کو دریافت کریں گے۔ یہ یونٹ ان داستانوں کی ادبی خوبصورتی اور ان کے سماجی و ثقافتی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد گار ثابت ہو گا۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے آپ یہ جان سکیں گے کہ یہ کیسے بلوچ سماج کی قدیم روایات اور طرزِ زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں اور ادب و تاریخ میں ان کا کیا مقام ہے۔ یہ یونٹ بلوچی ادب کی وراثت سے واقفیت کے ساتھ ان کہانیوں کی عالمی ادب میں اہمیت کو بھی واضح کرے گا۔ ہمیں امید ہے کہ ان داستانوں کا مطالعہ آپ کے لیے ایک دلچسپ اور بصیرت افروز تجربہ ہو گا۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ

1۔ بلوچی لوک داستانوں کے اہم عناصر کو سمجھ سکیں گے۔

2۔ ہانی و شسئے مُرید، بیبرگ و گرانا ز، شہداد و مہناز، کیّاو صدو، حمل وماہ گنج، عزت و مہرک جیسی مشہور داستانوں کے موضوعات اور کرداروں کا تجزیہ کر سکیں گے۔

3۔ بلوچی لوک کہانیوں کی ادبی اور تاریخی اہمیت کو جان سکیں گے۔

4۔ بلوچی تہذیب کے رومانوی پہلوؤں اور ان کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

4۔ رومانوی کہانیاں

داستانیں، لوک کہانیاں، اور رومانوی قصے کسی بھی قوم کی تہذیب، ثقافت، تاریخ اور جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ قصے زبانی روایت کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہو کر ایک قوم کے اجتماعی شعور اور تخیل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ یہ تاریخ کے ان پہلوؤں کو محفوظ کرتے ہیں جو رسمی تاریخ میں درج نہیں ہو پاتے۔ یہ کہانیاں محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اخلاقیات، زندگی کے اصول، اور انسانی جذبات کی گہرائیوں کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ لوک کہانیاں کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت کا جوہر ہوتی ہیں۔ یہ نہ صرف ثقافت کو زندہ رکھتی ہیں بلکہ قوم کی روایات، رواج، اور تاریخ کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے نئی نسل کو زندگی کے اہم اصول سکھائے جاتے ہیں۔ یہ قصے ہر زبان اور قوم کی تہذیبی وراثت کا ایک اہم حصہ ہیں۔

بلوچی لوک کہانیاں بلوچ قوم کی غیرت، محبت، اور قربانی کی لازوال داستانیں ہیں۔ ان میں بلوچ ثقافت کی عظمت، روایتی اقدار، اور زندگی کے وہ پہلو بیان کیے گئے ہیں جو محبت اور جدوجہد کے گرد گھومتے ہیں۔ بلوچوں کے لیے محبت محض ایک جذباتی کشش نہیں بلکہ ایک مقدس ذمہ داری ہے، جس کے ساتھ قربانی اور عزت کا درس جڑا ہوا ہے۔ ان کہانیوں میں محبت کو عظیم ترین جذبے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو زندگی اور موت کے بیچ جھولتا رہتا ہے۔ یہ داستانیں جنگ و امن، وفا و قربانی، اور عشق و محبت کی ایسی گہری عکاسی کرتی ہیں جو بلوچی لوک داستانوں کو منفرد بناتی ہیں۔

بلوچی لوک کہانیوں میں عشق کو اکثر جنگ اور جدوجہد کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ محبت کرنے والے کردار سماجی دباؤ یا دشمنوں کے خلاف اپنی عزت اور رشتے کی بقا کے لیے لڑتے نظر آتے ہیں۔ یہاں عشق ذاتی جذبے سے بڑھ کر ایک معاشرتی ذمہ داری اور غیرت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں قدرت کے مناظر، پہاڑوں، دریاؤں، اور صحراؤں اور بلوچ لینڈ اسکیپ کا ذکر بلوچ ثقافت کی فطرت سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ پاکستان کی دیگر زبانوں کی طرح بلوچی میں بھی کئی رومانوی قصے اور داستانیں موجود ہیں جو بلوچ تاریخ، تہذیب، اور رسم و رواج کو آشکار کرتی ہیں۔ جن میں سے کچھ کہانیاں ذیل میں دی جا رہی ہیں۔

4.1 ہانی و شئے مُرید

ہانی و شئے مُرید کی داستان سولہویں صدی کے رند ولا اشار اتحاد سے بلوچوں کے سبی و کچھی کے میدانوں پر قائم مرکزیت کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ ہانی رند بلوچوں کے معتبر میر مندَوّ رند کی بیٹی تھی۔ شئے مرید رند بلوچوں کے دعا گو گھرانے یعنی فقیر طبقے المعروف کہیریوں کے طائفے کے روحانی پیشوا شئے مبارک کا بیٹا تھا۔ ہانی بچپن میں شئے مبارک کے بیٹے شئے مریدؔ سے منسوب تھیں۔ ہانیؔ بڑی ہوئیں تو اس کے حسن کے چرچے ہونے لگے شئے مرید بھی دل و جان سے اس پر فدا تھے۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔

عہد کی پاسداری زمانہ قدیم سے بلوچوں کا قومی شعار رہا ہے۔ قدیم زمانہ میں کسی شخص کی ہمت، جرات اور شخصیت کو جانچنے کا واحد معیار یہ تھا کہ وہ اپنا قول نبھانے کے لئے کس حد تک قربانی دے سکتا ہے۔ روایات کے مطابق قبائل کے بعض سر گردہ شخصیتیں بھی باتوں کا عہد لیا کرتے تھے اور ایسے مواعید کی تکمیل کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے مستعد رہتے تھے۔ ایک دن بانکے رندوں کی ایک محفل جمی اور سر کردہ شخصیات نے اپنے اپنے قول و اقرار کئے۔ بلوچوں کے سربراہ میر چاکر خان نے عہد کیا تھا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ شئے مریدؔ نے قول دیا کہ جمعرات کے روز علی الصبح جو شخص اس سے جو کچھ مانگے گا، وہ اسے دے گا... میر انؔ نے قول دیا کہ وہ جس بلوچ خاتون کو سر پہ پانی کا مشکیزہ اٹھائے ہوئے دیکھے گا وہ اسے ایک کنیز خرید کر دے گا۔ میر جاڑوؔ نے عہد کیا تھا کہ جو شخص اس کے داڑھی کو ہاتھ لگائے گا، وہ اس کا سر قلم کر دے گا۔ ایک اور بلوچ سردار ہیبتانؔ نے قسم کھائی تھی کہ جس شخص کا اونٹ اس کے اونٹوں کے گلے میں آکر شامل ہو گا وہ ہر گز اسے واپس نہیں کرے گا۔

شئے مرید اور رندوں کے سربراہ میر چاکر کے درمیان دوستی تھی۔ ایک دن شئے مرید میر چاکر کے ہمراہ شکار پر گئے۔ پہاڑوں سے تھکے ہارے واپس آرہے تھے کہ پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئے تو سامنے میر مندَوّ کا گاؤں نظر آیا، انہوں نے وہاں سے پانی پینے کا فیصلہ کیا بلوچوں میں شادی سے قبل منگیتر سے بات نہیں کرتے... یوں میر چاکر میر مندَوّ کے گھر جا کر پانی مانگتے ہیں جبکہ شئے مرید کسی اور گھر سے جبکہ کچھ روایتوں کے مطابق ہانیؔ اور میر چاکر کی منگیتر سبی سے کچھ دور فاصلے پر پانی کی ندی کے پاس سہیلیوں کے ہمراہ موجود تھیں۔ میر چاکر نے کہا کہ آپ میری منگیتر سے پانی مانگو اور میں آپ کی منگیتر سے پانی مانگتا ہوں... یوں ہانیؔ پانی کے کٹورے میں کچھ تنکے ڈال کر میر چاکر کو پانی دیتی ہے اور کچھ دور فاصلے پر شئے مرید نے میر چاکر کی منگیتر سے پانی مانگا۔ میر چاکر تنکے ہٹا ہٹا کر پانی پی کر دل ہی دل میں ہانیؔ پر آگ

بگولہ ہو رہے تھے۔ پانی پینے کے بعد شئے مرید کے پاس پہنچے تو وہ الٹیاں کر رہے تھے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے تیزی سے پانی پیا جس کی باعث اسے قے ہو گئی۔ یوں میر چاکر کو ہانیؔ کی جانب سے کٹورے میں تنکے ڈال کر پانی پینے کی دانش کا راز کھلا۔ ہانی کی حسن کے چرچے تو پہلے ہی ہر سُو تھے اب تو میر چاکر ان کی ذہانت اور دانشمندی کے بھی قائل ہو گئے۔ میر چاکر جانتے تھے کہ مُرید حانیؔ سے کتنا پیار کرتا ہے۔

سولہویں صدی بلوچ تاریخ میں قول کی پاسداری کی صدی کہلاتی ہے۔ قول کی پاسداری میں میر جاڑوؔ داڑھی پکڑنے پر اپنے کمسن بچے کا سر تن سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ میر ہیبتانؔ کی آزمائش کے لئے میر چاکر رند کے کچھ اونٹ اس کے اونٹوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں مگر ہیبتان میر چاکر جیسے انتقام جو سردار کی طاقت و استبداد کی جانب سے متوقع خونریزی کے باوجود ایفائے عہد کی قول داری میں اونٹوں کو واپس نہیں کرتا۔ پھر میر چاکر کے فرمائش پر شئے مرید کی آزمائش کے لئے ڈوم گوّیے علی الصبح شئے مرید کے در پر آکر ہانی بخشش دینے کی صدا لگاتے ہیں وہ بھی عہد بلوچی کا پاس رکھتے ہوئے ہانیؔ ڈوم گوّیوں کو بخش دیتا ہے اور عمر بھر کا روگ پالیتا ہے۔

یوں خوبصورت اور خوب سیرت ہانیؔ کو جب چاکر شادی کی پیش کش کرتا ہے تو وہ شادی کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیتی ہیں۔ مگر ایک عورت کب تک مزاحمت کر سکتی تھی بالاخر وہ نکاح کر لیتی ہے۔ دوسری جانب شئے مُرید کی دنیا ویران ہو جاتی ہے۔ وہ راتوں کو میر چاکر کے قلعے نما محل کا طواف کرتا ہے۔ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا لیکن سب بے سود بالآخر ایک دن بھری محفل میں دوران گفتگو شئے مرید سے رہا نہ گیا۔ اس نے میر چاکر پر طنز کیا۔ اس کے والد شئے مبارک کو ناگوار گزرا اس نے مرید کو محفل سے بے عزت کر کے نکال دیا۔ اس نے باپ کی زیادتی کو ایک نیک و فرمانبردار بیٹے کی طرح برداشت کیا۔ لیکن اس نے ساتھ ہی اس بے عزتی کے بعد ترک وطن کا فیصلہ کیا اور حجازِ مقدس چلا گیا۔

میر چاکر کے گھر رہتے ہوئے ہانی ایک سلیقہ شعار عورت کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے ساتھ مزاحمت کرتی ہوئی بھی دکھائی دیتی ہے۔ راتوں کو ہانیؔ کو مرید کی یاد شدت سے آتی ہے تو وہ اپنے احساسات کو شاعری کا حسن بخشتی ہے۔ شئے مرید بھی حجاز مقدس میں ذکر و فکر میں مشغول ہونے کے باوجود ہانیؔ کو دل کے نہاں خانوں سے نکال نہ سکا۔ دل میں لگی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اتنا طویل سفر کرنے کے باوجود اُسے سکون نہیں ملا۔ اس نے اپنے جسم پر ستتر داغ ڈالے اور ستتر طویل نظمیں بھی کہیں۔ جن میں ایک ایک نظم سینکڑوں اشعار پر مشتمل ہے۔ شئے مرید

وہابیؔ کی عشقیہ شاعری میں باغیانہ سوچ، مزاحمت کا تصور، جدائی کی دردناک کیفیت، اپنی غلطیوں پر پشیمانی، ظلم و نا انصافی کے خلاف آواز، انمٹ محبت کے نقوش، قربانی وایثار کا جذبہ، پاگل پن و دیوانگی، گلے و شکوے، اسلاف کے اقدار پر فخر کے ساتھ ساتھ عشق کی آگ اور تپش میں جلنے والے عاشق کے دل کے ارمان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جب کوئی سہیلی ازراہ مذاق کہتی ہیں کہ کوئی تجھے شئے مرید کے بارے کوئی تازہ حال احوال دے تو اسے خوشی میں کیا دوگی ؟ حانیؔ ایک دم آپے سے باہر ہو جاتی ہیں اور کہتی ہیں اسے اپنے زیورات، پوشاک، سبی اور تیس ہزار کا سرمایہ، اصیل گھوڑے، چاکر کے مسلح افراد دان کر کے آخر میں اپنی جان وار دوں گی۔

ملک بدر شئے مرید فریضہ حج ادا کرنے، دن ورات ذکر و فکر میں گذارنے کے باوجود ہانیؔ کے فراق میں اشعار کہہ کر واپسی کا فیصلہ کر کے ملنگوں کے دستے کے ہمراہ ملنگ کے بھیس میں سبی پہنچتا ہے۔ سبی کے قلعے کے باہر رندوں کے تیر و کمان کے ذریعے نشانہ بازی کا مقابلہ جاری تھا۔ مریدؔ کو یہ مقابلہ دیکھ کر گذرے ہوئے اوقات کی یاد آگئی۔ اسے پھر شوق اٹھا کہ وہ بھی تیر اندازی کرے۔ اس نے بھی کمان مانگی اس وقت اسے کسی نے نہیں پہچانا۔ بہر حال ان لوگوں نے اسے تیر کمان مہیا کر دیئے مگر اس نے یکے بعد دیگرے کمان کے ٹکڑے کر دیئے۔ اب رندوں کے پاس شئے مریدؔ کے لوہے کی پرانی کمان کے علاوہ اور کوئی مضبوط کمان نہ تھی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ شخص صاحب کرامت نظر آتا ہے۔ اسے مرید کا کمان لا کر دے دو۔ چنانچہ اس کی کمان جو بکریوں کے باڑے میں پڑی ہوی زنگ آلود ہو چکی تھی لا کر دے دی گئی شئے مریدؔ نے اس سے سات تیر چلائے اور ساتوں ٹھیک نشانے پر لگے۔

شئے مریدؔ کی نشانہ بازی نے لوگوں کے شک کو مضبوط کیا انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ تیر انداز شئے مریدؔ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یوں حانیؔ کی طرف ایک شخص کو بھیجا گیا کہ تم بچپن میں اکٹھے کھیلتے رہے ہو، شئے مرید کی پہچان کے لئے کوئی نشانی یا شناخت بتا دو۔ حانیؔ نے ران کے کیل اور شے مرید کے ابرو کے قریب زخم کے نشانات بتائے یوں شئے مرید کو دوبارہ پہچانا گیا۔ حانی کا چاکر کے ساتھ صرف نکاح ہوا تھا مگر ازدواجی تعلقات تو استوار ہی نہ ہو سکے تھے۔ اکثر معتبرین اس بارے میں آگاہی رکھتے تھے۔ پر خاموش تھے۔ مرید کے آنے پر ان کے منہ کھل گئے۔ وہ میر چاکر کو حانیؔ کو طلاق دے کر شئے مرید سے نکاح پر زور ڈالتے ہیں۔ میر چاکر بھی کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ یوں حانیؔ و شئے مرید کو زبردستی نکاح کروادیتے ہیں۔ اس وقت شئے مرید کہتا ہے۔

پھول جیسی حائیؔ، پھول جیسی حائیؔ
تمہارے عشق نے مجھے جلاڈالا ہے
اپنے ننگے کندھے مجھے نہ دکھا
مجھے دید سے اندھا نہ بنا
حائیؔ تیرے قابل نہیں رہا
میرے جوڑے کار ہو چکے ہیں
مجھ میں جوانی کی طاقت نہیں رہی
میں جل بھن چکا ہوں
اب ایک عورت تو ایک عورت ہے
جس وقت تم مجھے درکار تھیں
بھائی مجھے بھائی نہ بناتے تھے
دوست مجھے دوست نہیں بناتے تھے
برادری میں میرا نام "دیوانہ" تھا
اب مجھے ساتھیوں سے جدا نہ کر
مجھے اندھا نہ بنا۔

چھوٹی عمر میں بیماری، شفایابی کے بعد شئے مبارک کا گود، وہاں سے شئے مرید سے منسوبی، بچپن سے جوانی میں قدم رکھنے تک یکجا ہونے کے خواب۔ پھر ایفائے عہد میں ڈوم گوّیوں کو بخشش ہو جانا، میر چاکر کے محل تک پہنچنا۔ شئے مرید کی پشیمانی پھر ترک وطنی، شئے مرید کے غریب الوطنی کے دوران میر چاکر کے بلند و بالا قلعے، شاہانہ جاہ و جلال، جاہ و حشمت، دھن دولت، شاہانہ آرام و آسائشیں دیکھ کر بھی مرغوب نہ ہونا۔ چاکر کے گھر میں رہ کر ان کی منکوحہ بن کر ظاہری طور پر خاتون اوّل کی ذمہ داریاں نبھانا، ان کی غیر موجودگی میں امور قلعہ سنبھال لینا، مشکل اوقات میں میر چاکر کی مشیر بن جانا، اس محل میں شئے مرید کی یاد میں شعر کہنا، آخر تک میر چاکر پر مرید کو فوقیت دینا، میر چاکر سے طلاق، شئے مرید سے شادی اور شئے مرید کی جانب سے ایک مرد کے فرائض کی انجام دہی سے عاری ہونے کی حقائق

سے واقف ہونے کے باوجود مرید کو اپنانالازوال فیصلہ ہے جو انہیں ممتاز حیثیت بخشتی ہے۔

4.2 بیبرگ و گراناز:

بیبرگ رند سولہویں صدی کے بلوچوں میں بہادر انسان، نامور شاعر ،مشہور عاشق اور بھرپور رومانوی شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ وہ بہادری، دلیری، شمشیر زنی، شہسواری، دوراندیشی، مثبت کردار اور فہم فراست کا نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ خداوند نے انہیں بہادری اور اوالعزمی سے خوب نوازے رکھا تھا، وہ ظلم و ناروائی کے راستے سے دور رہتے تھے لیکن ان کی بہادری کے ڈنکے بجتے تھے، وہ میر چاکر رند کے بھانجے اور میر باہر خان کے بیٹے تھے۔ ان دنوں سبی اور کچھی کے میدانوں پر رند و لاشار اتحادیے کی مرکزیت قائم تھی، ان کے خوشی و غم، جینا و مرنا اور دکھ و سکھ سانجھے تھے۔ دونوں بلوچ قبیلے بلوچستان میں نامور قبائل میں شمار ہوتے تھے۔ سبی یعنی سیوی، بولان سے اوپر خراسان تک، نیچے سرسبز کچھی سے سندھ تک ان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ سبی اور مولہ تک پھیلے ندی نالوں اور چشموں کے پانی سے ہونے والی آبادی اور خوشحالی انہیں راس نہ آئی، انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نکال لیں۔ ایک دن گہرام لاشاری کے بیٹے رامین نے شکار پر واپس آتے ہوئے میر چاکر رند کے باہوٹ (پناہ) میں رہنے والی گوہر جتزئی کے اونٹنیوں کے ایک بچے کو کاٹ دیا، رندوں نے اس بات کا برا منایا کہ رامین نے ان کے ہمسایہ خاتون کے اونٹنیوں کے ایک بچے کو کیوں مارا؟ میر چاکر نے کہا کہ اب لاشاریوں کے ساتھ ایک لڑائی لڑنی پڑے گی یوں یہ معاملہ جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔

میر چاکر رند زیرک انسان تھے اور حد درجہ ضدی بھی تھے۔ انہی دنوں میر چاکر سے کچھ نوجوان ناراض ہو کر افغانستان چلے گئے اور وہاں پر حاکم ذوالنوں بیگ نے انہیں کسی بات پر قید خانے میں ڈال دیا۔ وہ جانتے تھے کہ رند و لاشار کی یہ جنگ طول پکڑ لے گا۔ اس لئے انہوں نے بیبرگ کو کہا تم وہاں جا کر نوجوانوں کو آزاد کروا کر لاؤ۔ بیبرگ وہاں چلے گئے اور ان کی بھی کسی بات پر ذوالنوں بیگ سے تو تو میں میں ہو گئی، جس کی پاداش میں اسے بھی قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ قید خانے میں بے خوابی کی عالم میں آدھی رات کو سروں کے تار چھیڑ دیتے تھے۔ ذوالنوں بیگ کے ناز و نخرے والی بیٹی گراناز کا آرام گاہ قید خانے کے عین سامنے تھا۔ جب بیبرگ سروں کے تار چھیڑتے تو بے ساختہ اٹھ کر اپنی ڈیوڑھی پر بیٹھ کر اسے سنتی رہتی اور اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ ایک دن وہ اپنے والد سے پوچھنے لگی کہ آپ کے قید میں یہ کون ہے؟ جس نے راتوں کو ہمارے نیندیں حرام کر دی ہیں، اسے آزاد کیا جائے۔ حاکم نے اپنے بیٹی کی بات قبول کر کے بیبرگ کو اپنے دوستوں کے ہمراہ رہا کر دیا۔ بیبرگ کو جب معلوم ہوا تو اسے گراناز سے ملنے کا اشتیاق بڑھا

اور سیدھا لوہار کے پاس پہنچے، چند میخ بنوائے، رات کو اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر محل کے نیچے سے میخوں کے ذریعے دیوار چڑھنے لگے۔ آدھی منزل پر گرانا ز کے پہرے داروں نے اسے دبوچ لیا۔ بیبرگ نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جیب سے اشرفیاں نکال کر ان کے حوالے کر دیئے اور خود اپنی محسن خوبرو حسینہ کے پاس پہنچ گیا اور بیٹھ کر محفل کیا۔ اس واقعے کو وہ اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں۔

میں نے کہ لوک گیتوں کے تار چھیڑے
مغلوں کے بنے ہوئے قلعے میں
تلملا اٹھیں ترک خواتین راتوں میں
آہ وفغاں کرنے لگے آدھی رات کو
بے چین ہوئیں قلعے کی حسینائیں
کشادہ پیشانی اور دلکش ابرو کے ساتھ
کھڑی ہو کر جھانکنے لگیں کچھ
دیکھنے لگیں سب میری قد و قامت کو۔

بیبرگ نے گرانا ز کو دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے پر فدا ہوئے۔ چند دن وہاں قیام کے دوران وہ اپنی محبوبہ سے ملاقاتیں کیں، راتوں کو وہ اپنی محبوبہ کے پاس ہوتا اور دن کو شکار پر چلا جاتا۔ ایک رات محبوبہ نے کہا مجھے اپنے ساتھ لے چل اب میں کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بیبرگ یوں گرانا ز کو اپنے ساتھ لے کر بلوچوں کے دیس روانہ ہوئے، جب وہ سیوی کے نزدیک پہنچتے ہیں تو گرانا ز نے اس سے پوچھا کہ اے میرے دوست بتا چاکر کا لشکر کتنا بڑا ہے؟ اور رند کتنے ہیں؟ بیبرگ نے جواب دیا کہ چالیس ہزار میر چاکر کا خاص لشکر ہے، دس ہزار میرالی ہیں اور دس ہزار خاص تیغ زن ان کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں اور گہرام لاشاری کے پاس تیس ہزار جنگجو موجود ہیں لیکن ان سے ہماری دشمنی چل رہی ہے۔ گرانا ز نے کہا کہ پھر چلو گہرام کے پاس جاتے ہیں کیونکہ چاکر تو تیرا عزیز ہے وہ تو آپ کی عزت کے لئے جنگ کے میدان میں ضرور کودے گا اور گہرام بھی ہمسایہ گیری میں تیری مدد کرے گا۔

بیبرگ اپنی محبوبہ کے کہنے پر گہرام کے پاس پہنچا، گہرام نے انہیں اپنے پاس پناہ دے دی۔ اس نے ان کو قسم

قسم کے کھانے پیش کئے لیکن بیبرگ وہاں کھانا نہیں کھاتا رہا، وہ کھانا کسی کونے میں دبا کر برتن واپس کرتے رہے۔ گراناز نے بیبرگ سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے، تو اس نے جواب دیا پناہ دینا بلوچی شان اور روایت کے مطابق ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل کلاں رند اور لاشاری رزم آراہوں میں لاشاری سردار کا نمک کھا کر پھر کس طرح اس کے مقابلے میں میدان میں اتروں گا۔ اس دوران گراناز کے والد اور حاکم افغانستان اپنے لاؤ لشکر کے ہمراہ بولان سے گذر کر ڈھاڈر کے نزدیک پڑاؤ ڈال کر خیمہ زن ہوا اور قاصد بھیج کر پیغام بھجوایا کہ میر الملزم حوالے کرو یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ گہرام لاشاری نے میر چاکر کو قاصد بھیج کر اطلاع دے دی۔ رند و لاشار نے بیبرگ کو ان کے حوالے کرنا اپنی ننگ و ناموس کی خلاف ورزی سمجھ کر جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور یوں دوسرے دن معرکے کا دن مقرر ہوا۔

بیبرگ نے رات کو بیٹھ کر غور و فکر کیا کہ غلطی میری ہے اور میری وجہ سے لاکھوں افراد جنگ میں جھونکے جائیں گے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کو اکیلے جا کر حاکم کے پاس پیش ہو جائیں گے۔ بیبرگ آدھی رات کو چھپتے چھپاتے حاکم کے پہرے دار کو قتل کر کے خیمے میں جا پہنچے اور حاکم کے مالشئے کا گلا دبا کر انہیں مالش کرنے لگا۔ وہ بے ڈھنگ مالش سے بیدار ہوئے اور پوچھنے لگے کہ تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں بیبرگ ہوں، تیرا گناہ گار ہوں، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، جو سزا دینی ہے آپ کی مرضی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ آپ کو میرے پہرے دار اور مالشئے نے نہیں دیکھا، بیبرگ نے خیمے کے کونے میں چادر دور کر کے مالشئے کی لاش دکھا کر اپنی تلوار حاکم کو پیش کی ۔ انہوں نے معاف کر کے بیبرگ کو چھپا کر اپنے پہرے داروں، لشکر میں شامل معتبرین اور حکام کو بلایا اور دریافت کرنے لگا کہ اگر میرا گناہ گار اس وقت یہیں دستیاب ہو جائے تو اسے سزا دوں یا معاف کروں؟ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا سزا دی جائے۔ حاکم نے دوبارہ پوچھا کہ سزا کیا ہونی چاہئے؟ کسی نے کہا جلتے تیل میں ڈالا جائے، کسی نے کہا گھوڑی کی دم میں باندھ دیا جائے یعنی بھانت بھانت کی بولیاں ہونے لگی اور ہر ایک اپنا مشورہ دے رہا تھا۔ حاکم نے جواب دیا کہ میں نے آپ لوگوں کی بہادری دیکھ لی، تم لوگ جس بے دھیانی میں خواب خرگوش کے مزے لے کر سو رہے تھے اور بیبرگ میرے خیمے تک پہنچا وہ مجھے مار دیتے تو۔ اس پر شرکاء محفل خاموش ہو گئے اور حاکم نے اپنی بیٹی بیبرگ کے عقد میں دینے اور صبح صلح کا اعلان کا حکم جاری کر دیا۔

4.3 شہداد و مہناز:

شہداد و مہناز بھی سولہویں صدی کی ایک اور رومانوی داستان ہے، جس کو بلوچوں کی سنہری عہد کی الم انگیز

داستان کی حیثیت حاصل ہے۔ شہداد بلوچوں کے نامور شخصیت میر چاکر کے فرزند تھے اور مہناز اس کی خالہ زاد بہن تھی۔ کچھ مورخین کے مطابق وہ شہداد کی چچازاد تھی، لیکن تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ وہ ان کی خالہ زاد تھی۔ مہناز بلوچ تاریخ کی ایک ایسی بہادر خاتون ہیں جو حقوق نسواں یا صنفی جدوجہد کی استعارہ خاتون سمجھی جاتی ہیں۔ جس نے فرسودہ روایات، سماجی بندھنوں، ناانصافی کے رسموں، غیر انسانی بندشوں سے ٹکرا کر بہتان تراشی کے ذریعے عائد الزامات کو غلط ثابت کرکے ابدی رسوائی کا طوق اپنے گردن سے اتار کر انسانی اور سماجی ارتقا میں وہ تاریخ رقم کی ہے کہ جس کی مثال آج کی صنفی امتیازات کے خلاف کام کرنے والی خواتین بڑے فخر سے دے سکتی ہیں۔ انہیں اگر اس خطے میں تحریک نسواں کا محرک کہاجائے تو بے جانہ ہوگا جنہوں نے سولہویں صدی میں ناانصافی کے بلند وبالا دیواروں سے ٹکرا کر اور آہنی زنجیروں کو توڑ کر بھرپور عملی کردار کے ذریعے انسانی سماج میں جبر اور ناانصافی کے بندھنوں کو رد کرکے بے مثال کارنامہ انجام دیاہے۔

میر شہداد کی دوبیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام مُرگوآں تھا اور دوسری کا نام مہناز تھا۔ مہناز بہت حسین اور ذہین خاتون تھی اور شہداد کی خالہ زاد بھی۔ وہ ایک دوسرے سے بچپن سے محبت کرتے تھے جبکہ مرگو کے ساتھ انہوں نے بغرض مجبوری شادی کی کیونکہ قبائلی رسوم کے مطابق وہ اسے خون بہا کے عوض ملی تھی جس کو چھوڑنا یا اس سے شادی نہ کرنا اجداد کے روایت کے منافی تھا۔ میر شہداد کا ایک دوست میر عومر تھا جس سے میر شہداد کی گہری دوستی تھی، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میر شہداد شکار پر گئے تھے۔ میر عومر جھٹ پٹے وقت میر شہداد کے ہاں مہمان بن کر آیا۔ مہناز نے میر عومر کی پذیرائی کی، کھانا وغیرہ کھلانے کے بعد گھر کے قریب مہمان خانے میں چارپائی پر بستر لگا کر مہمان کو آرام کرنے کو کہا گیا۔ آدھی رات کو جب گھر کے سارے افراد سو رہے تھے۔ مہناز کی سوکن مُرگوآں نے مہناز کے جوتے پہنے میر عومر کی چارپائی تک گئی اور پھر آکر سو گئی۔ صبح ہوئی مہمان نے اپنی راہ لی۔ جب میر شہداد گھر آئے تو مُرگوآں نے میر شہداد کو اس بدگمانی میں مبتلا کر دیا کہ رات مہمان کے بستر میں مہناز چوری چھپے جا گھسی۔ اس نے مہناز کے جوتوں کے نشان بھی دکھائے جو گھر سے مہمان کے بستر تک اور بستر سے گھر تک اس نے خود بنائے تھے۔ مُرگوآں کی چال کامیاب ہوگئی اس کی باتیں سن کر میر شہداد اپنی وفاشعار بیوی پر شک کرتے ہوئے اس سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ اچانک پیدا ہونے والی صورتحال مہناز کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ایک طرف بچپن کا پیار، دوسری طرف سوکن کی سازش سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کے بعد شہداد کا اتنابڑا الزام اور ظالمانہ رویہ۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق کافی سوچ بچار کے بعد

سہیلیوں کے مشورے کے نتیجے میں طے پایا کہ مُرگوسی کی غیر موجودگی میں ایک مرتبہ میر شہداد کو اصل حقائق سے آگاہی دی جائے، ہو سکتا ہے کہ حقیقت سے آگاہی کے بعد معاملے کو رفع دفع کرے۔ لیکن شہداد اس کی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے طلاق دینے کی ٹھان لی۔ طلاق کی بات سن کر مہناز کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے، لیکن وہ شعور کی زیور سے آراستہ ہونے کے باعث بیٹھ کر مار دھاڑ کرنے، رونے پیٹنے اور احساس کمتری کا شکار ہونے کے بجائے ثقافت کی علامت بن کر یہ بری خبر کی اطلاع اپنے ورثا کو یوں بھیج دیتی ہے۔

میں جا کر چوراہے پر بیٹھوں گی
شاید میرے علاقے کا راہ نورد ملے
اپنے ہاتھ کی چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
اپنے کانوں کے آویزے
اپنے گیسوؤں کے کچھ بال
اپنی اوڑھنی کا ایک ٹکڑا
راہ نورد کے ہاتھوں بھجواؤں گی
تا کہ میرے مہربان والد کو خبر پہنچے
کہ شہداد نے میری عزت خاک میں ملادی۔

جب مہناز کے طلاق کی خبر ان کے ورثا تک پہنچتی ہے تو وہ لشکر کی صورت میں شہداد کے گاؤں کی جانب آتے ہیں۔ ان کی لشکر کشی سے علاقے میں خوف وہراس پھیل جاتا ہے۔ مہناز کے ورثا جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو ماجرے سے آشنا ہوتے ہی طیش میں آجاتے ہیں، مہناز انہیں دیکھ کر ان کی جانب لپک کر اپنی بے گناہی کی دُہائی دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس کے خلاف سازش ہوئی ہے۔ وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے کہتی ہے کہ آپ لوگ سارے قبیلے کو جمع کریں اور ان کے سامنے مجھ سے قسم لیں۔ اگر میں بے قصور نکلی تو ٹھیک وگرنہ جو چور کی سزا وہ میری سزا! قبیلے کے لوگ اکٹھے کیے جاتے ہیں اور ایک کھلے میدان میں ایک چولہا بنا کر بڑی کڑہائی میں تیل بھر کر اس کے نیچے خوب آگ جلائی جاتی ہے، جب تیل خوب کھولنے لگا تو اس میں انگوٹھی ڈال دی جاتی ہے اور مہناز کو کہا جاتا ہے کہ وہ انگوٹھی نکالے۔ وہ بڑے اطمینان سے ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکال کر پھینک دیتی ہے۔ یوں اپنے اوپر لگے ہوئے تہمت کا داغ دھو کر مہناز

اپنے میکے چلی جاتی ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مہناز عومر سے شادی کر لیتی ہے ۔ میر عومر سے مہناز کی شادی کے بعد شہداد بپھر جاتا ہے اور اسے ایک مرتبہ پھر اپنے الزامات کے جائز ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے اور ڈوم گوّیوں کے ذریعے شکوے بھرے اشعار کی صورت میں الزامات بھرا پیغام بھیجتا ہے اور وہ شہداد کے بے جا الزامات کا جواب اپنے تیکھے، ترچھے، چبھنے والے الفاظ کے ذریعے دیتی ہے۔ مہناز بلوچ قبائلی سماج کے ظلمت کی اونچی چوٹی پر کھڑی ہو کر اپنی عفت و حرمت پر اٹھنے والی انگلیوں کا رخ موڑ کر تہمت کے داغ کو دھو کر ظلمت کے رسوم کے زنجیروں کو توڑ دیتی ہے۔ مہناز نے اپنی ایک نظم ''من ہما انجیراں پتن تاکیں'' میں جذبات کی شدت اور ادراک کی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے اور احساساتی سطح پر اپنے لئے درخت کا امیج تراش کر اپنے نسائی کردار سمیت خود کو جس دھج سے بیان کیا ہے، اس سے قبل کی بلوچی شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ درخت کے استعارے پر مبنی یہ شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے جس میں وہ اپنی عصمت اور پاک دامنی کو یوں بیان کرتی ہے:

میں انجیر کے چوڑے پتوں والا
وہ درخت ہوں
جو تنگ گھاٹیوں میں
پانی کے گہرے گڑھوں کے کنارے اُگتا ہے
میں چٹانوں اور ناقابل عبور گھاٹیوں کا
وہ سربلند پیڑ ہوں
کہ جب جنوب کی تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں
تو اکثر درختوں کا سر جھکا دیتی ہے
لیکن میرا سر اب تک کوئی بھی ہوا نہیں جھکا سکی
اور نہ ہی کوئی یار میرے تنے کو تر کر سکی
میرا گریبان جام عومر نے باندھا ہے
اب میرا بدن قبر ہی دیکھے گی
یا پھر جام عومر ہی
میرا گریبان کھولے گا۔

سولہویں صدی کی مہناز بلوچ سماج میں فرسودہ روایات، ظلمت کے رسموں، ناانصافی کے بندھنوں پر مبنی سماجی بندھنوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر کے مصلحت، مصالحت اور موقع پرستی جیسے وقتی لفظوں کے اثرات سے آزاد ہو کر نہ صرف اپنے پاکیزہ کردار کو واضح کرتی دکھائی دیتی ہے بلکہ اپنی عصمت اور عزت کی خاطر مردانہ سماج کا بھرپور انداز میں مقابلہ کر کے بہادری کی تاریخ رقم کرتی ہے۔ وہ ایسا نسائی کردار ہیں کہ تن تنہا آندھیوں کا رخ موڑ کر تاریک سماج میں چھائے ہوئے اندھیروں کو اجالے میں تبدیل کرتی ہیں ۔ ان کی جدوجہد، بغاوت اور شاعری کی نظیر نہیں ملتی۔

4.4 کیّا و صدو:

کیّا مغربی مکران کے مشہور علاقے باہو کے مالدار شخصیت ملک دوستین ہوت کا بیٹا تھا۔ زمانہ قدیم میں جب بلوچوں کے ایک علاقے میں قحط سالی ہوتی تھی تو وہ اپنے مال مویشیوں کو ہمراہ لے کر چراگاہوں کی تلاش میں ملحق علاقوں میں پھیل جاتے تھے۔ جب باہو میں خشک سالی ہوئی تو کیّا خان اپنے ڈھور ڈنگر، مویشی اور ریوڑ لے کر مشرقی مکران کے علاقوں میں گذر بسر کرتا رہتا تھا۔ مکران کے قدیم بندرگاہ کلمت کے قریب سلسلہ ہائے کوہ اورناچ ہے اور ان پہاڑی وادیوں میں سدابہار کے پھول کھلتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں سیلابی دریا پورالی آہستہ آہستہ بہتا رہتا ہے۔ اونچے پہاڑوں پر درخت اگے ہوئے ہیں، اسی دریا سے راستہ گذرتا ہے اور اس کے دونوں جانب ہری بھری گھاس اُگی ہوئی ہوتی ہے اور جگہ جگہ پیش یعنی مزری اور گز یعنی جھاؤ کے جھاڑیاں اور درخت اگے ہوئے ہوتے ہیں۔

صدو کا تعلق کلمتی قبیلے سے تھا اور ان کے والد سیاہو کلمتی اپنے علاقے کلمت کے سرکردہ اور مالدار شخص تھے۔ دونوں کے خاندان مکران کے وسطی اور شمال مغربی بستیوں میں خشک سالی کے باعث چراگاہوں کے تلاش میں اورناچ سے بیلہ تک کی پٹی میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک روز جب کیّا اپنے ریوڑ کو پانی پلانے کے غرض سے دریا پر آیا تو خود پانی پینے کے لئے بیٹھ گیا اور اس نے ابھی چُلّو میں پانی بھرا ہی تھا کہ اس کی نگاہیں اٹھیں اور اس کے سامنے کلمت کی حسین و جمیل دوشیزہ صدّو کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ صدّو بھی اس وقت اپنے ریوڑ کو پانی پلانے دریا پر لائی تھی اور خود بھی چُلّو میں بھر بھر پانی پی رہی تھی۔ سولہ سترہ برس کی دوشیزہ کو کیّا نے جب پانی پیتے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا اور ہر چُلّو کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ صدّو آہستہ آہستہ اس کے دل اور اس کی روح میں اتر رہی تھی۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اس وقت کہاں ہے۔ شاید صدّو نے اسے نہیں دیکھا تھا اور وہ بے نیازی سے پانی پی کر اٹھی اور اپنے جانوروں کو اکٹھا کیا اور ہانکتی ہوئی دریا کے مشرق کی سمت روانہ ہو گئی۔

چراگاہ میں مویشی چرانے کے دوران ان کی متعدد بار مد بھیڑ ہوتی رہی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی بھیڑ کو پکڑنے کے لئے بالکل اس کے قریب سے گذرتی ہوئی آگے چلی گئی اور وہ دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہی چراگاہ میں ریوڑوں کی موجودگی کی وجہ سے کیّا کے دل کی پیاس کی شدت بڑھتی گئی اور کیّا نے صدّو کے والد سے رشتہ طلب کیا۔ صدّو کے باپ نے اس کا حسب و نسب پوچھا اور خاندانی حالات دریافت کئے۔ دونوں کا تعلق اپنے اپنے علاقے کے نامور قبیلے اور آسودہ حال خاندان سے تھا۔ اس لئے رشتہ قبول کر لیا گیا اور منگنی کی رسم بھی ہو گئی۔

وقت اور حالات نے کروٹ بدلی، موسم تبدیل ہوا، بادل جل تھل برسے اور باہو کی چراگاہیں سرسبز ہوئیں تو کیّا خان اپنے مال مویشی لے کر باہو کی جانب چل پڑے۔ روانگی سے قبل اس نے صدو کے والدین سے شادی کے تفصیلات اور تاریخ طے کر لیا۔ قبائلی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے باعث وہ مقررہ وقت تک پہنچ نہ سکا۔ صدو کے والدین نے کیّا کا کافی انتظار کیا اور پیغام بھیجے لیکن کیّا کی کوئی خیر خبر نہیں آئی بلآخر انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی ٹھان لی۔ صدو کیّا کو دل و جان سے چاہتی تھی لیکن وہ والدین کے سامنے بے بس تھی۔ لیکن اس نے اپنے والد کو کہا کہ اس قدر جلدی کیا ہے۔ میرا منگیتر ضرور واپس آئے گا ہمیں کم از کم موسم گرما تک ضرور انتظار کرنا چاہئیے تاکہ بعد میں کوئی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ صدّو کے ماں باپ مان گئے اور اس وقت یہ بات ٹل گئی۔ صدّو سارا سارا دن پہاڑوں اور چراگاہوں میں اپنے ریوڑ کو لئے ہوئے دوڑتی پھرتی اور کیّا کی یاد میں رات اور دن گزارتی۔ وہ کیسا انسان تھا، کیسا شریف النفس، وہ سوچتی میں کتنی مرتبہ اس کے پاس سے ہو کر گزری مگر اس نے مجھ سے بات تک کرنے کی جرات نہ کی اور نہ کبھی نظر اٹھا کر دیکھا۔

آخر کار اپنی کیفیت بیان کرنے لئے پیغام بھیجتی ہے اور کہتی ہے کہ اے پیامبر تو باہو کے علاقے میں ہاڑہ نامی گاؤں چلے جانا۔ وہاں میٹھے پانی کی ایک ندی بہتی ہے اور ندی کنارے ایک تناور پیڑ ہے۔ وہاں اعلی نسل کے اونٹوں کا گلہ چر رہا ہو گا۔ وہاں ایک گھبرو رہتا ہے۔ جامہ زیب جوان دوسرے خوش پوشوں سے ممتاز ہے، اس کی کمر ترکش کے کمر بند نے پتلی بنادی ہے۔ اس کے شانے پر ڈھال ہو گا۔ وہاں کلمتی سورماؤں کی محفل جمی ہوئی ہو گی۔ تو ان کے پاس جا کر بیٹھ جانا اور دوستوں سے دور لے جا کر کان میں بتانا۔ آنے کا وعدہ کر کے غائب ہو، دس دن میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب دو سال گذر گئے ہیں۔ شادی کے لئے پلی ہوئی بھیڑیں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ دعوت کے لئے پسے ہوئے آٹے میں کیڑے پڑ گئے ہیں اور لکڑیوں کو دیمک لگ چکی ہے۔ رقص کرنے والے مرکھپ چکے ہیں۔ جلدی سے آجاؤ کہ تمہاری جگہ کوئی دوسرا لینے کو ہے۔

محبوبہ کا پیغام سن کر کیّا موچی کو پاپوش سینے، درزی کو لباس بنانے، اونٹوں کے گلے سے شِلنگ نامی اونٹنی کو نہلانے اور اسے پھول جڑے مہار ڈال کر روانہ ہوئے۔ شِلنگ باہو کی کھاڑی سے گذر کر جب آنکاڑو کے دہانے پہنچا تو اونٹنی کے قدموں سے نغمے پھوٹ رہے تھے اور اس کے پیروں سے دوشیزاؤں کی تالیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کارواڑ کی طویل مسافت طے کر کے مشہور جگہ کھپّر پہنچے۔ زرّیں اور پسنی کا علاقہ آیا تو اونگھ سی آگئی، آنکھیں کھلیں تو وہ صدّو کے گھر پہنچ گئے تھے۔ اس کی آمد کے بعد بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور اس طرح دو بچھڑے ہوئے یکجا ہوئے۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ وقت مسرت و انبساط کا یونٹ بن جاتا ہے۔ چاندنی موسیقی بن جاتی ہے اور ستارے اُن کے لیے رقاص بن جاتے ہیں۔ فطرت کے سارے نکتے یک نکتہ ہو جاتے ہیں۔ گویا دھرتی بنی ہی اُس جوڑی کے لیے ہو۔ مگر غم تو خوشی کا ازلی و ابدی ساتھی ہوتا ہے۔ اور صدو اپنی پہلی اولاد کی پیدائش کے وقت جہانِ فانی سے رحلت کر جاتی ہے اور کیا پوری زندگی صدو کی محبت میں دیوانہ بن کر گزارتا ہے۔

صدو کے بچھڑنے کا کیّا نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

ترجمہ:

کل میں کیچ کی دل آرام وادی میں سے سفر کر رہا تھا۔
میں مُولا کے دہانے آرہا تھا۔
میرے پاس انار تھا اور خوشبو دار الائچی سامنے سے سحاق آرہا تھا۔
میں نے الائچی آمیز منہ سے پوچھا،
خوش آمدید سحاق، خیر خیریت؟
احباب کے بارے نہ پوچھو پریشان ہو جاؤ گے
لعل جیسی صدّو بیمار پڑ گئی اور بے چینی میں چیختی رہتی ہے
باہو کے قریب پڑی کراہتی ہے
دردِزہ میں مبتلا ہے
اگر بیٹا ہو جائے تو اس کے بہادر و مضبوط ہاتھ ہوں گے
اگر بیٹی ہو جائے تو اس کا چاند سا چہرہ ہو گا

چاند چہرہ اور مانگ پہ سورج
میں نے دوست سے زبردستی رخصت لی
میں نے شِلنگ پر ڈنڈے برسانے شروع کیے،
اے شِلنگ، خدا کرے تمہیں غیر معمولی قوت ور فتار ملے
دوست کے آخری دیدار سے مجھے محروم نہ کر
میں تیزی سے خیموں کے جھنڈ میں گیا
محبوبہ کی لمبی کراہیں آرہی تھیں
اگر نہ مرو اور اس بار بچ جاؤ
تو میں ہر سال فربہ جانور قربان کیا کروں گا
تمہارے سر درد دور کرنے بھورے رنگ کا دنبہ ذبح کروں گا
غلام آزاد کرالاؤں گا
(مگر) یاسمین کا پھول مرجھانے لگا
وہ پکے ہوئے لیموں کی طرح گر گئی
خدا اپنی اچھی بخشش واپس لے گیا
وہ اسے بند گاہ ندی لے گئے (غسل دینے)
وہ اس کے گلے سے ہار اور زیور اتارتے ہیں
اس کے ہاتھوں سے چوڑیاں اور چاندی کے زیور اتارتے ہیں
انگلیوں سے مندریاں
ستواں ناک کے زیور اتارتے ہیں
پیروں سے سانپ سر جیسے پازیب
پھر میری محبوبہ کو زمین پہ لٹایا
اسے سفید کپڑے میں لپیٹ دیا

بھائیوں نے محبت بھرے کندھوں پر اٹھالیا
اور دور میدان کے کونے تک لے گئے
اُس کے لیے ایک تنگ دہانے والی قبر کھود دی
لعل کو اس کے اندر لٹادیا
اُس کے اوپر مٹی اور گاراڈال دیا
بھائی ماتمی چبوترے پہ آئے
محبوبہ کی ماں روتی ہے، محبوبہ کے عزیز روتے ہیں
محبوبہ کی عزیز سہلیاں روتی ہیں
میں بھی اندر اندر رویا
آنسو میرے برف رنگ (سفید) چادر پر گرتے ہیں
رات میرے داناخدا نے صبح کر دی
سیٹھوں کی ماہ رخ بیٹیاں باہر آتی ہیں
وہ اپنے ہار زیور، صاف کرتی ہیں اور بادام رنگ کے دوپٹے جھٹکتی ہیں
رنگین دوپٹے سر پر ڈالتی ہیں
مگر ان میں موجود نہیں لعل جیسی صدّو۔۔

4.5 حَمَّل وماہ گنج:

حَمَّل ساحل مکران کے طویل رقبے پر پھیلے ہوئے علاقے کلمت کے نامور سردار جیئند کے بیٹے تھے۔ وہ انتہائی حسین و جمیل انسان تھا اور ساتھ ہی نہایت بہادر اور خوش سیرت بھی تھا۔ بہت سے امیر زادیاں اس سے شادی کے خواہش مند اور متعدد رئیس گھرانے اسے اپنا داماد بنانے کے آرزو مند تھے۔ مگر وہ ان سب باتوں سے بے پرواہ نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں مصروف رہتے تھے۔ شکار کے دلدادہ تھے۔ اس کی اس صفت کے باعث بلوچ شعرا نے اسے ''گور کُش'' اور ''زحم جن'' کے القاب سے نوازا تھا اور اس کا ذکر اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ جب سردار جیئند بوڑھا ہو گیا تو اس نے ایک روز اپنے بیٹے سے شادی کی بات کی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی میری زندگی میں

ہو جائے۔ حَمّل بڑا سعادت مند لڑکا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ جہاں کہیں جس لڑکی سے کہیں میں شادی کرنے کو تیار ہوں۔ اس کا باپ اس بات سے خوش ہوا اور اس نے اپنے قرابت داروں میں سے ایک حسین دوشیزہ "ماہ گنج" سے اس کی شادی کر دی۔ ماہ گنج نہایت ہی سلیقہ مند اور زیرک لڑکی تھی۔ چند ہی دنوں میں اس نے حمّل کے دل میں ایسا گھر کر لیا کہ وہ بالکل اس کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ ماہ گنج سے محبت اور شکار کے شوق سے لطف اندوز زندگی بسر کرتا رہا اور اسے دنیا کی کوئی فکر نہ تھی۔ خدا نے اسے دو لڑکے عطا کئے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد جیئند بیمار پڑا اور چند دنوں کی علالت کے بعد خالق حقیقی سے جاملا۔

حمّل کو قبیلے کا سردار مقرر کیا گیا اور اس نے بہادری اور شجاعت کی بنیاد پر اپنے علاقے کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ اس کی عقل مندی اور بہترین انتظام کی وجہ سے پورا علاقہ نہایت خوش حال ہو گیا۔ وہ حکومت کرتا تھا، سیر و شکار میں وقت گذارتا تھا اور پوری محبت ماہ گنج پر نچھاور کرتا تھا۔ اسی زمانے میں پرتگیزیوں نے زنجبار سے مسقط اور عمان تک اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر برابر چھاپے مارتے رہتے تھے یہاں تک کہ مکران کی ساحلی علاقے تک، ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہ تھے۔ انھوں نے بلوچستان کے ساحل علاقے جیونی، گوادر، پسنی، اورماڑہ اور سونمیانی کی بندر گاہوں پر متعدد حملے کئے۔ یہاں سے کشتیاں تجارت کے غرض سے زنجبار، عدن، بصرہ اور ہندوستان سمیت مختلف علاقوں تک آتی جاتی تھیں۔ اس لئے حَمّل جیئند نے اپنے علاقے کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے کمربستہ ہو کر مقامی لوگوں کے ہمراہ پرتگیزیوں کی تاک میں نکلے اور بارہا ان سے مڈبھیڑ ہوئی اور اس میں پرتگیزیوں کو شکست ہوئی۔ وہ کلمت کے بلوچوں کی بہادری اور جرات کا مقابلہ نہ کر سکے اور صلح اختیار کر لی لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ کلمت آنے جانے والی کشتیوں پر چھاپے مارنے لگے۔ اس سے میر حمّل اور ان کے درمیان اختلافات بڑھتے چلے گئے اور دوبارہ کشیدہ صورت حال پیدا ہوئی اور باہمی زور آزمائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حمّل کبھی کبھار ساز و سامان لے کر کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے دوستوں کے ہمراہ سمندر کی جانب نکل جاتا تھا۔ تاکہ سیر و تفریح کے ہمراہ دشمن کے نقل و حمل پر نگاہ رکھی جاسکے۔ ایک روز وہ سمندر کی سیر کو روانہ ہوا۔ وہ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بڑا زبردست طوفان آگیا اور سمندر میں تلاطم بپا ہو گیا۔ اس طوفان میں وہ لوگ اپنا راستہ بھول گئے اور چھ دن اور رات سمندر میں یونہی بھٹکتے رہے اور ساتویں دن ساحل کے قریب پہنچے اور ان کے جان میں جان آئی۔ مگر جب وہ لنگر انداز ہونے کے لئے بڑھ رہے تھے تو پرتگیزیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ دراصل وہ عمان کے ساحل

پر پہنچے تھے اور وہاں پرتگیزیوں کا بڑا اڈہ تھا۔ پرتگیزیوں کی ایک کشتی حمّل کی کشتی کے قریب پہنچی اور وہ تلواریں لے کر حمّل اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ سب کے سب اس ناگہانی مصیبت سے بدحواس ہو گئے اور ایک ایک کر کے سمندر میں کود کر بھاگ نکلے اور میر حمّل کشتی پر اکیلے رہ گئے۔ اس نے حملہ آوروں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور حملہ آوروں نے متعدد افراد قتل کر دیئے اور خود بھی زخمی ہو گئے۔ اس کی بہادری، شمشیر زنی اور جوانمردی کو دیکھ کر پرتگیزیوں نے طے کیا کہ اس شخص کو زندہ پکڑ کر سردار کے پاس پیش کر کے انعام واکرام وصول کیا جائے۔ چنانچہ اسے کمند ڈال کر پکڑنے کی کوشش کی گئی تو اس میں انہیں جلد کامیابی حاصل نہیں ہو پائی تو کچھ پرتگیزی پشت کی جانب سے ان کشتی پر سوار ہوئے اور چاروں جانب سے کمندیں پھینک کر گرفتار کر کے اپنے سردار کے ہاں پیش کیا۔

پرتگیزیوں کے سردار نے جب حمّل کی جوانی، خوبصورتی اور متناسب جسم کو دیکھا اور حیران ہوا اور اس کی گرفتاری کا سبب پوچھا تو انہوں نے سارے حالات اور واقعات بیان کئے تو اس نے حمّل کو قید خانے میں ڈال دیا۔ کچھ دنوں کے بعد دوبارہ طلب کیا اور اسے پورے حالات سے آگاہی دی اور بتایا کہ وہ خود بھی ایک سردار ہے۔ اس پر پرتگیزیوں نے ان سے صلح کرنے، ان کا مذہب اختیار کرنے اور اپنے قبیلے کی حسین لڑکی سے شادی کی پیش کش کی تا کہ بلوچستان کے ساحل ان کے لئے ہمیشہ کے لئے کھل جائیں لیکن اس نے ماننے سے انکار کیا۔ جس پر پرتگیزیوں کے سردار کو بہت غصہ آیا اور اس نے اسے دوبارہ قید خانے کی تاریک کوٹھڑی میں ڈلوا دیا اور حکم دے دیا کہ اس کا کھانا پینا بند کر دیا جائے۔ پرتگیز سردار کی بیٹی اتفاق سے اس وقت وہاں موجود تھی اور سارا ماجرا خود دیکھ رہی تھی۔ اس نے جب حمّل کی خوبصورتی اور بہادری کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس گرویدہ بن گئی۔

وہ رات کو کھانا لے کر قید خانے پہنچی اور پہرے داروں کو انعام واکرام دے کر حمّل تک پہنچ گئی۔ حمّل قید خانے میں اپنے خیالات میں مگن تھے۔ لڑکی نے بڑی محبت سے اسے مخاطب کیا اور کہا کہ میں تمہارے لئے کھانا لے کر آئی ہوں۔ حمّل نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کی مدد کیوں کر رہی ہے۔ اس نے صاف صاف بتا دیا کہ میں سردار کی بیٹی ہوں اور تم دل و جان سے فریقتہ ہوں۔ تم میرے باپ کی شرائط مان لو تو میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جاؤں گی اور پھر ہم مزے سے زندگی بسر کریں گے۔ حمّل نے جواب دیا کہ وہ اس سے کسی قسم کی سودے بازی نہیں کر سکتا۔ وہ تو بہت دن ہوئے اپنا دل ماہ گنج کو دے چکا ہے اور اسے اپنی رفیقہ حیات بنا چکا ہے۔ وہ اس سے بے وفائی کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے کھانا قبول کرنے سے بھی انکار کیا اور اسے واپس بھیج دیا۔ لڑکی کہنے لگی اے مغرور آدمی تمہارے اس رویے

سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے اور پیش کش قبول نہ کر کے تو نے میری توہین کی ہے۔ میں تجھ سے اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔

ادھر کلمت میں حمّل کے غائب ہو جانے سے اس کی بیوی ماہ گنج اور ماں کا برا حال تھا۔ ماہ گنج دن رات اس کا راستہ تکا کرتی تھی اور اسے یاد کر کے آنسو بہایا کرتی تھی۔ انہی دنوں وہاں سے ایک جوگی کا گذر ہوا جو ہاتھ کی لکیریں اور پیشانی دیکھ کر لوگوں کے قسمت کا حال بتایا کرتا تھا۔ ماہ گنج نے اسے بلوایا اور تھیلا گندم دیا اور اشعار میں کہا کہ اے جوگی میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے بتا کہ آخر میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ میرا حمّل کہاں ہے۔ میں اس کے غم میں گھلی جا رہی ہوں۔ وہ نہ آتا ہے نہ اپنی کوئی خبر بھیجتا ہے۔ جوگی نے اس کا ہاتھ دیکھا اور کہنے لگا کہ حمّل ایک ایسی جگہ پہنچ گیا ہے جہاں سے سے واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ وہ بہت افسردہ رہتا ہے مگر وہ قید میں ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ماہ گنج کا برا حال ہو گیا۔ اب اس کے پاس دن رات سوائے آنسو بہانے کے اور اپنے حمّل کو یاد کرنے کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ غموں کے دریا میں ڈوب گئی۔

ایک دن پرتگیزی سردار نے حمّل کو دوبارہ دربار میں بلوایا اور اسے کہا کہ وہ آخری مرتبہ اس کا جواب سننا چاہتا ہے۔ اگر وہ اس کی شرائط مان لے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ اسی وقت اس کی بیٹی بھی وہاں آ کر بیٹھ گئی اور اس سے کہنے لگی اس مغرور شخص نے میری بے عزتی کی ہے اور ہمارے مذہب کو برا بلا کہا ہے۔ جس قدر جلد ہو سکے اسے قتل کروا دیجئے۔ کیونکہ یہ بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے اگر یہ بچ کر بھاگ گیا تو اپنی فوج لے کر ہم سے لڑنے کے لئے آجائے گا۔ سردار نے ایک مرتبہ پھر حمّل سے پوچھ لیا سوچ لے۔ حمّل نے اسے کتا کہہ کر پکارا اور کہا کہ تم عہدہ اور حسین عورتوں کا لالچ دے کر مجھے خرید نہیں سکتے، میں تم سے نفرت کرتا ہوں اور اپنی قوم اور اپنی پیاری بیوی ماہ گنج کا وفادار ہوں۔ یہ سن کر پرتگیز سردار کو بے حد تاؤ آیا اور اس نے جلاد کو اسے فوری قتل کرنے کا حکم دیا۔

اس وقت حمّل نے ہواؤں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم جا کر جلدی میری محبوبہ کو پیغام دینا اور کہنا میں مجبور ہوں مگر تیری یاد لے کر دنیا سے جا رہا ہوں۔ میرے بعد تم کسی بہادر سرکش سے شادی کر لینا اور میری ماں سے کہنا کہ تیرے بیٹے نے بڑی بہادری سے جان دے دی اور اپنی قوم اور بیوی اور تمہارا وفادار رہا۔ اس کے زبان سے یہ اشعار نکلے ہی تھے کہ جلاد نے اس کی گردن اس کے جسم سے جدا کر دی۔

4.6 عزت و مہرک:

عزت و مہرُک انیسویں صدی کی عشقیہ داستان ہے۔ مہرُک کا اصلی نام مہر خاتون تھا اور وہ پیردان (پیلُو کا

جنگل) مغربی مکران سے تعلق رکھنے والے رئیس قبیلے کے نامور شخصیت سائک کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی حسین و جمیل بیٹی کو پیار سے مہرُک کہتا تھا۔ اس دور میں مُلّا فاضل رند بلوچی زبان کے نامور شاعر تھے اور وہ مکران کے معروف علاقے مند کے رہائشی تھے۔ بلوچ سماج میں مُلّا فاضل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زمانہ قدیم میں بلوچ معاشرے میں پڑھے لکھے فرد کو مُلّا کہا جاتا تھا۔ اس دور میں مُلّا قاسم رند اور مُلّا بوہیر بھی بلوچی زبان کے مشہور شاعر تھے۔ مُلّا قاسم مُلّا فاضل کے بھائی اور مُلّا بوہیر ان کے گہرے دوست تھے۔ مُلّا فاضل اور مُلّا بوہیر اکثر اکھٹے سیر و تفریح کے لئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ دونوں سرباز گئے تو وہاں کے پیردان نامی قصبے سے ان کا گذر ہوا۔ مہرُک اپنے دریچے میں کھڑی تھی تو مُلا بوہیر کی نگاہ اس پر پڑی وہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے اشارے سے مُلّا فاضل کو اس کی جانب متوجہ کیا اور مُلّا فاضل اسے دیکھ کر اس کا شیدائی ہو گیا۔ جب انہیں پتہ چلا وہ اپنے چچازاد سے منسوب ہے تو وہ خاموش ہو گئے۔

مند میں مُلّا فاضل کا ایک اور ہم عصر اور دوست شاعر مُلّا عزت بھی تھا جو ایک خوبصورت نوجوان اور معروف شاعر تھا۔ مُلّا فاضل اکثر اس کے سامنے مہرُک کے حسن کی تعریف کیا کرتا تھا۔ اس کے خوبصورت آنکھوں، چمکتے ہوئے چہرے اور گھٹاؤں کی مانند بالوں کی تعریف سن سن کر عزت اس پر نادیدہ عاشق ہو گیا۔ مُلّا عزت سنار کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا اور وہ شہر شہر گھوم کر زیورات بنایا کرتا تھا۔ وہ مہرک دیکھنے کے لئے پیردان چلا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اسے ایک دو مرتبہ مہرک کی دید نصیب ہوئی۔ اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھا اور اس کی تعریف میں بے شمار اشعار کہے۔ بے چینی بڑھتی چلی گئی تو اس نے مہرُک کے باپ کے پاس مہرُک سے شادی کا پیغام بھیجا۔ چچازاد سے منسوبی کی بات سننے کے باوجود وہ بضد رہے اور مسلسل قاصد بھیجتا رہا۔ جب سائک اور اس کے رشتہ داروں کو یقین ہو گیا کہ عزت مہرک پر دل و جان سے فدا ہو چکا ہے اور کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ عزت سے اس قدر مال طلب کیا جائے کہ وہ دے نہ پائے اور پھر خود مایوس ہو کر خاموش ہو جائے، چنانچہ انہوں نے ایک دن عزت کے پیامبر سے کہا کہ عزت کو کل ہمارے پاس بھیج دینا۔ عزت سن کر خوشی سے ناچنے لگا اور اگلے دن مہرُک کے والد کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم مہرُک کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کو تیار ہیں مگر تمہیں ہماری کچھ شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ عزت نے کہا کہ مہرک کے لئے مجھے ہر شرط منظور ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ تمہیں حق مہر کے طور پر دس نوعمر کنیز و غلام، سو بکریاں، سات گائیں اور پانچ ہزار روپے نقد، کپڑے اور زیورات دینا ہوں گے۔ عزت نے کچھ مال بطور نشانی اسی وقت ادا کر کے مزید چیزوں کی ادائیگی کے لئے کچھ مہلت مانگی اور گوادر چلا گیا۔ گوادر پہنچ کر

وہ مہرُک کے لئے کپڑے اور زیورات کے انتظام میں لگ گیا۔ دن رات مہرُک کی یاد کو سینے سے لگائے اس کے لئے سامان اکٹھا کرنے لگا۔

اُدھر ایک دن مہرک اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ندی پر بال دھونے گئی تھی کہ اسی اثنا میں ایک قافلہ پیر دان آ رہا تھا۔ قافلہ جب قریب آیا تو ساری لڑکیاں چوکڑیاں بھرتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مہرک وہاں سے اٹھ نہ سکی کیونکہ وہ بال دھو رہی تھی۔ جب قافلے کے غیر مردوں کی آوازیں قریب ہوئیں تو مہرک کو ایک ترکیب سوجی اور اپنے بال کھول کر چھوڑ دیئے، جس کے باعث وہ مکمل ڈھک کر رہ گئی۔ دور سے وہ بالوں کا ایک جھاڑ نظر آنے لگی۔ قافلے والوں نے اسے دور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے کے لئے ندی پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ حسین و جمیل پری کی جگہ ایک کالی چیز بالوں کی جھاڑی کی شکل میں پانی میں موجود ہے۔ وہ بے حد حیران ہوئے اور ان پر ایک خوف طاری ہو گیا۔ وہ خوف کی حالت میں پیر دان پہنچے اور ماجرا بیان کیا۔

پیر دان کے لوگ سمجھ گئے اور انہوں نے بتایا کہ وہ مہرُک ہو گی۔ جس پر پری کا شبہ ہوا ہے۔ یہاں اور کسی کے اتنے بڑے بال نہیں ہیں، تم لوگوں نے ضرور اسی کو ندی میں دیکھا ہو گا۔ اگلے روز قافلے کا میر کارواں مہرُک کے والد سائک کے پاس پہنچا اور وہاں اس نے مہرُک کو بھی دیکھا اور ششدر رہ گیا اور کافی دیر اس کی تعریف کرتا رہا۔ اس کی تعریفیں اور اور گھور گھور کر دیکھنا مہرُک کے لئے بلائے بے درماں ثابت ہوا۔ روایت ہے کہ مہرک کو اس کی نظر کھا گئی۔ ان کے جاتے ہی وہ بیمار پڑ گئی۔ بہت علاج کرایا، حکیموں کے پاس لے گئے لیکن اس کے بیماری کی تشخیص نہیں ہو پائی اور تیسرے ہی دن جان سے گذر گئی۔

عزت، اس افتاد سے بے خبر سائک کے طلب کردہ زیورات اور دیگر سامان جمع کر کے پیر دان پہنچا۔ تو اسے پتہ چلا کہ مہرُک تو اسے چھوڑ کر بہت دور جا چکی ہے جہاں سے آج تک کوئی واپس نہ آ سکا۔ یہ سن کر اس پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے پہلے اس بات پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا اور ہر ایک سے اس کی تصدیق کرنے لگا۔ جب اسے بٹھا کر سارے واقعے کی تفصیل بتائی گئی تب اسے یقین ہوا۔ حقائق سے آشنا ہونے پر، عزت پہ گویا بجلی گر پڑی۔ اس کا پیر دان میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اس قریے نے تو اس سے اس کی زندگی چھین لی تھی۔ اس نے اپنے اشعار میں اس قصبے کو بد دعا دی کہ اے پیر دان مہرُک کی موت کے بعد تجھے آگ لگ جائے تو راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ یہاں کوئی انسان نہ بسے اور یہ چٹیل میدان بن جائے، جہاں گھاس کا ایک تنکا بھی نہ اُگے۔

کہتے ہیں کہ اس کی بد دعا کا اثر تھا کہ وہاں کی رونقیں ختم ہو گئیں اور وہاں کے رہنے والے دوسرے علاقوں میں جا بسے اور وہاں چند لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔ عزت نے اپنی تمام مال ومتاع لٹا دی تو دل شکستہ ہو کر پنجگور پہنچ گیا اور وہاں رہائش اختیار کر لی۔ جب مہرُک کی یاد تاب نہ لا سکا تو وہ جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں کا راہی بن گیا اور درویشی اختیار کر کے شہر شہر، قریہ قریہ نکل پڑا اور باقی عمر مہرک کی یاد میں نغمے گاتا رہا۔ اپنے احساسات کو اس شعر میں بیان کرتا ہے۔

میں حق کا متلاشی ہوں
دینِ مصطفی پر قائم ہوں
میں کہ عزت بنِ للئہ ہوں
شئے مرید کی طرح آتشِ عشق میں جل رہا ہوں
کشکول وعصا لیے کابل کے فقرا کی طرح
گداگری کرتا ہوا ہر شہر گھوما
مگر مہرک کو نہ پایا
پنجگور سے جیونی اور وہاں سے کابل اور غزنی، گنداواہ اور علاقہ مری
سرباز سے پیر دان اور وہاں سے سیستان تک
مگر مہرک نہ ملی۔۔

پنجگور میں ان کے نام سے ایک علمی اور ادبی ادارہ عزت اکیڈمی قائم ہے جو بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے کام کرتا ہے۔

خود آزمائی

1۔ بلوچی لوک داستانوں کی تعریف کریں اور ان کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالیں۔

2۔ ہانی شئے مرید کی داستان کے اہم موضوعات بیان کریں۔

3۔ بیبرگ گراناز کی محبت کی داستان بلوچ ثقافت کی کن اقدار کی عکاسی کرتی ہے؟

4۔ حمل جیند اور شہداد مہناز کی کہانیوں میں کرداروں کی قربانی اور وفاداری کے عناصر کا تجزیہ کریں۔

5۔ بلوچی رومانوی قصے موجودہ دور کے ادب اور سماجی اقدار پر کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں؟

یونٹ نمبر:5

دینی ادب

تحریر:ڈاکٹر رحیم بخش مہر
نظر ثانی:ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل:ڈاکٹر حاکم علی برڑو

فہرست

	یونٹ کا تعارف	87
	مقاصد	87
5	دینی ادب	88
5.1	بلوچی میں دینی ادب کی روایت	88
5.2	بلوچی میں حمدیہ شاعری	89
5.3	بلوچی میں نعتیہ شاعری	91
5.4	قرآن کے تراجم وتفاسیر	93
5.5	احادیث کے تراجم	94
5.6	سیرت رسولؐ	95
5.7	سلام	97
	خودآزمائی	98

یونٹ کا تعارف

زیر نظر یونٹ دینی ادب پر محیط ہے۔ اس یونٹ میں آپ کو بلوچی زبان میں دینی ادب کی روایت کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیں گی، جس میں حمدیہ، نعتیہ شاعری، قرآن پاک اور احادیث کے تراجم، سیرت نبیؐ اور سلام کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ جس سے آپ نہ صرف بلوچی میں دینی ادب کی روایت سے آگاہ ہوں گے بلکہ بلوچی کے منتخب دینی اصناف کے بارے میں بھی جان جائیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ

1۔ بلوچی دینی ادب کے پس منظر کو جان سکیں۔

2۔ بلوچی دینی ادب کے شعری اصناف کے بارے میں بنیادی معلومات سے آگاہ ہو سکیں۔

3۔ بلوچی میں قرآن پاک کے تراجم و تفاسیر کی روایت سے آشنا ہو سکیں۔

4۔ بلوچی میں سیرت نگاری کی روایت سے واقف ہو سکیں۔

5۔ دینی ادب

5.1۔ بلوچی میں دینی ادب کی روایت

ویسے تو باب الاسلام سندھ کو کہا جاتا ہے۔ لیکن کچھ محققین کی رو سے اسلام کے عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہونے سے پہلے بلوچستان سے ہو گزرے تھے۔ یوں بلوچستان کو اس خطے میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا شرف سب سے پہلے حاصل ہے۔ ویسے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے ہی سے بلوچستان کے تعلقات خلافتِ اسلامیہ سے استوار ہو چکی تھیں۔

بلوچی زبان میں ادبی تخلیق کا سلسلہ صدیوں پر مشتمل ہے، جس میں دینی ادب کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ تمام مواد زبانی یا Oral صورت میں موجود رہا ہے۔ بلوچی میں باقاعدہ دینی ادب کی تحریری صورت ڈھاڈر میں واقع مذہبی امور پر کام کرنے والی تنظیم "مکتبہ درخانی" سے رواج پاتی ہے، جس کے بانی مولانا محمد فاضل درخانی تھے، اس ادارے کی بنیاد 1886ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ ادارہ چونکہ عیسائی مشنری کی جانب سے بلوچی و براہوئی میں بائبل و دیگر عیسائی مذہب سے منسلک کتابوں کی طبع کے بعد وجود میں آئی تھی اور اس کے بنیادی مقاصد میں اپنی مادری زبانوں (بلوچی، براہوئی) میں اپنی قوم کو مذہبی تعلیمات دینا، قرآن، احادیث، سیرت نبویؐ و مذہب اسلام سے وابستہ دیگر شرعی اصول وضابطوں سے اپنی ہی زبان میں آشنائی دینا تھا۔ سو انہیں مقاصد کے تحت اس زمانے کے جیّد علمائے کرام قرآن مجید کے تراجم کے ساتھ سیرت نبویؐ، احادیث، فقہ، نماز کے آداب، حمدیہ و نعتیہ شاعری کا ایک نہایت وقیع ذخیرہ کتابی صورت میں شائع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے محققین کے مختلف آراء سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمان براہوئی ان کتابوں کی تعداد ہزار کے قریب بتاتے ہیں جبکہ کامل القادری کے مطابق براہوئی کے تین سو سے زائد اور بلوچی کے دو سو کے قریب کتابیں چھاپی گئی ہیں۔ جبکہ اس حوالے سے ایک مستند تحقیق جناب ڈاکٹر عبدالرزاق صابر صاحب کی ہے ان کے مطابق مکتبہ درخانی کی تصانیف کی کُل تعداد ۲۸۰ ہے۔ جن میں براہوئی کی ۱۲۰، بلوچی کی ۹۱، اردو اور فارسی کی پانچ پانچ، عربی کی دس اور سندھی زبان میں دو کتابیں چھپ کر شائع کی گئی ہیں۔ بلوچی زبان کو برٹش ادوار میں بھی تحریری شکل رومن رسم الخط میں دی گئی تھی، عربی رسم الخط کی صورت مکتبہ درخانی اور باقاعدہ ادبی و تخلیقی صورت میں پچاس کی دہائی میں ملی ہے۔ بلوچی میں دینی ادب کا سلسلہ یکسوئی کے ساتھ آگے کی جانب چلی ہے۔ موجودہ عہد تک اس سلسلے

میں بلوچی زبان میں دینی ادب کا کافی ذخیرہ سامنے آچکا ہے۔ جس میں قرآن مجید کے بہت سے تراجم اور تفاسیر، سیرت نبوی پر مختلف کتابیں اور کافی تعداد میں مضامین شامل ہیں، اسی طرح حمدیہ و نعتیہ شاعری کے بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور فقہ و دیگر اسلامی تعلیمات کے حوالے سے بہت سی کتابیں بھی لکھی جاچکی ہیں۔

5.2 بلوچی حمدیہ شاعری :

بلوچی لوک شاعری اپنی موضوعاتی تنوع کی وجہ سے زندگی کے بیشتر موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جس میں ایک صنف کو "سپت " کے نام سے جانا جاتا ہے، جسے بچے کی پیدائش کے وقت عورتیں کورس کی صورت میں گاتی ہیں۔ سپت میں خدا کی حمد و ثنا، رسولؐ کی نبوت، اہل بیت سے محبت اور بزرگانِ دین کے بارے میں منقبت کے بول شامل ہوتے ہیں۔ بلوچی کلاسیکی شاعری میں بھی حمدیہ و نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ بلوچی میں حمدیہ شاعری کی محکم روایت بلوچی نیم کلاسیکل ادوار سے ہوتی ہے، جس میں طویل رزمیہ و بزمیہ شاعری میں شعر کی ابتدا حمدیہ و نعتیہ اشعار سے کی جاتی تھی۔ اس ادوار کے بیشتر شعرا فارسی زبان کی وسیلے سے عربی تہذیب و کلچر سے متاثر نظر آتے ہیں، یہی سبب ہے کہ بلوچی میں ہونے والی شاعری اپنی ابتدائی کلمات میں مذہبی پیرائے میں بیان ہوتی ہے، جس میں حمدیہ، نعتیہ اور منقبت جیسے موضوعات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ بلوچی میں حمدیہ شاعری کی بنیادیوں تو مکتبہ درخانی سے ہی نظر آتی ہے جس میں سرِ فہرست جام درک ہیں، لیکن اس کے بعد اک سلسلہ چل نکلتا ہے جس میں ہر شاعر اپنی شعر کی ابتدا نعتیہ اشعار سے کرتی ہے، جس میں خدا کی بڑائی اور اس کے صفت و ثنا میں اشعار کہنے کی باقاعدہ روایت عام ہوتی ہے۔ ملا فاضل کے ہاں حمدیہ اشعار ملاحظہ کیجیئے :

من کہ سبحان الذی اسری یات کناں
گوہراں بہر دیاں وقف آں ذات کناں
صدق و حق علم الیقینءِ سرءَیات کناں
نعت سر داریں نبیاں مدح و صلوات کناں

اسی طرح اس دور کے نامور شاعر ملا بھرام کے خدائے برتر سے اپنی عقیدت و احترام کا جزبہ کچھ اس طور شعری پیکر میں ڈھلتا ہے۔

قل اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

پاک بسم اللہ نام تور حمن ور حیم

یاالہی تووت ءِ در دانی حکیم

دار منی ایمان ءَ سلامت شاہ ءِ قدیم

اس ادوار میں اور بھی بے شمار شعرا ہیں جنہوں نے بلوچی شاعری میں حمدیہ و نعتیہ اشعار کی محکم روایت رکھی ہے، جن میں سے کچھ نام اس طرح ہیں جو انسال بگٹی، مولانا حضور بخش جتوئی، عبدالباقی درخانی، فقیر شیر جان، فیضل فقیر و دیگر شامل ہیں۔

ان شعری مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلوچی میں حمدیہ اشعار کہنے کی روایت باقاعدہ نیم کلاسیکل شاعری کے ادوار سے شروع ہوتی ہے جسے پروان چڑھانے میں اس عہد کے شعرا کا اہم کردار ہے اور اس روایت کو بعد کے آنے والے شعرائے کرام نے جدید طرز پر استوار کیا۔

جدید دور میں جب بلوچی باقاعدہ تحریری شکل میں لکھی جانے لگی تو دیگر اصناف کے ساتھ نعتیہ شاعری کی روایت بھی سامنے آتی ہے۔ دیگر شعری اصناف کے ساتھ بلوچی میں حمدیہ اور نعتیہ شاعری کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی، چونکہ حمدیہ اور نعتیہ شاعری کے لئے کوئی خاص صنفی یا ہیئتی بندش نہیں ہوتی ہے لہٰذا بلوچ شاعروں نے بھی مختلف شعری ہیئتوں میں حمد و نعت کے اشعار کہے ہیں۔ اس جدید دور کے نمایاں شاعروں میں عبدالحکیم حقگو، محمد حسین عاجز عبدالرحیم صابر، مولوی خیر محمد ندوی، سید ہاشمی، عنایت اللہ قومی، ابراھیم عابد، پیر محمد زبیرانی، صبا دشتیاری، مبارک قاضی و دیگر شعراء شامل ہیں۔ ان شاعروں نے اپنی حمدیہ اشعار میں خدا کی وحدانیت، اس کی بادشاہی اور قدرت کے مختلف نظاروں کے توسط سے اپنی عقیدت و محبت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعراء کے اشعار بمعہ ترجمہ پیش کی جاتی ہیں۔

چونیں تئ تعریف گوشاں تئ شان جل جلالہ

الحمد اللہ گوشاں تئ شان جل جلالہ

حق قل ھو اللہ احد تئ زینت انت اللہ الصمد

واللہ تو یک و یگانہ ءِ تئ شان جل جلالہ (عبدالحکیم حقگو)

ترجمہ:

تیری ثنا میں کیا کہوں تیری شان جل جلالہ
الحمد اللہ کہتا ہوں تیری شان جل جلالہ
حق قل ھو اللہ احد تیری زینت اللہ الصمد
بے شک یگانہ تیری ذات تیری شان جل جلالہ

محمد حسین عاجز خدا کی تعریف و ثنا کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

کناں من حمد و تعریف ءَ تئ اظہار یا اللہ
منی چے طاقتیں یک زرہ یے مقدار یا اللہ
نی تو خالق مولی منی تو واجہ و آقا
من بندہ گناہگاراں توئے غفار یا اللہ

ترجمہ :

سازِ ہستی کی ابتدا تو ہے
قابلِ تعریف و ثنا تو ہے
تو ہے ہر اک شے میں پنہاں
ان نگاہوں سے ماسوا تو ہے
تیری درگاہ میں مراد کا ہے التجا
بخش گناہوں کو میری خدا تو ہے

بلوچی زبان میں حمدیہ شاعری کی روایت صدیوں پر مشتمل ہے، کلاسیک عہد میں بھی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں اسی طرح جدید دور میں بھی حمدیہ شاعری کی روایت کافی مستحکم شکل میں موجود ہے۔

5.3 بلوچی میں نعتیہ شاعری :

بلوچی نعتیہ شاعری کی روایت بھی لوک ادب سے ملتی ہے۔ لوک روایت کے اصناف سپت میں حمدیہ شاعری کے ساتھ نعتیہ شاعری بھی ملتی ہے۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی وحدت و توصیف، شمائل و خصائص کے نظمی اندازِ بیاں کو نعت یا نعت خوانی یا نعت گوئی کہا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت سے صحابہ کرام نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ نعت لکھنے والے کو نعت گو شاعر جبکہ نعت پڑھنے والے کو نعت خواں یا ثناخواں کہا جاتا ہے۔ نعت کو بلوچی زبان میں ''وزبت'' کہا جاتا ہے۔

بلوچی ادب میں شاعری کی ابتدا سے آج تک ''وزیت'' یعنی نعت الگ صنف کی حیثیت سے نظر نہیں آتی۔ قدیم بلوچی شاعری میں حمد کے بعد نعت کے چار مصرعے ضرور ساتھ ہوتے تھے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی میں نعت گوئی کی روایت موجود رہی ہے، تاہم بلوچی شاعری میں باقاعدگی کے ساتھ نعت لکھنے والے شعرا میں جوانسال بگٹی، حسین عاجر اور قاضی عبدالرحیم صابر اہم نام ہیں۔ ان دونوں شاعروں کے نعت گوئی کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ جس میں حسین عاجز کے مجموعے کا نام ''کلام عاجز'' ہے جو کہ حمد و نعت کا مجموعہ ہے اور صابر صاحب کا مجموعہ ''ثاقیءِ کوثر'' نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ مومن بزدار اور پیر محمد زبیرانی نے بھی بلوچی زبان میں نعت گوئی کی ہے۔

بلوچی نعت کے متعلق اثیر عبدالقادر شاہوانی لکھتے ہیں کہ پیغمبر آخر زمان حضرت محمدؐ کی تعریف اور توصیف کے لئے شاعری کی صنف نعت اسلامی ادب میں مروج و موجود ہے۔ ہر مسلمان کا پختہ ایمان اور عقیدہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر اور حبیب ہیں۔ آپؐ کے لئے دل میں محبت رکھنا اور ان سے عقیدت رکھنا ایک مسلمان کا فطری اور شعوری خاصہ ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ان کو بحیثیت مسلمان ایک منفرد اور اعلیٰ مقام سے مشرف کرتا ہے۔ نعت میں شاعر اپنی محبت و عقیدت کے جذبات کا اظہار انتہائی خوبصورت الفاظ و اشعار کی مالا میں پرو کر پیش کرتا ہے۔ حُبِ رسولؐ کے قلبی جذبات سے بلوچی شاعری بھی مالامال ہے۔ بلوچی کے قدیم اور درمیانی دور کے شعرا اپنی منظومات کی ابتدا حمد باری تعالیٰ سے کرتے ہوئے ایک دو شعروں کے بعد حضور پاک سرور کائنات ﷺ کی نعت کی جانب رجوع کرتے تھے لیکن موجودہ دور میں مکمل طور پر نعت گو شاعر موجود ہیں۔ جو اپنے طور پر نعت گوئی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ کلاسیکل دور کے ملا فاضل رند، ملا قاسم رند، مولوی حضور بخش جتوئی، جوانسال بگٹی، ملا ابراہیم آگے چل کر اس کاروان میں میر گل خان نصیر، عطاشاد، قاضی عبدالرحیم صابر، میر عیسےٰ قومی، عبدالواحد آزاد جمالدینی، ملک محمد رمضان بلوچ، حکیم خدائے رحیم، محمد اسحاق بزدار، اثیر عبدالقادر شاہوانی، غوث بخش صابر، یٰسین بسمل، بانل دشتیاری،

مبارک قاضی، حاجی فقیر محمد عنبر، ابراہیم عابد، زاہدہ رئیسی راجی، یعقوب سیفی، بابل ہمراز بلوچستانی، نصیر سرکوہی، گوہر بلوچ اور مجید مستاگ وغیرہ شامل ہیں۔

5.4 قرآن پاک کے تراجم و تفاسیر:

بلوچی زبان میں دینی کتابوں کے تراجم انیسویں صدی کے نصف میں اس وقت شروع ہوتے ہیں جب ڈھاڈر کے مقام پر مولانا محمد فاضل درخانی کے سربراہی میں مکتبہ درخانی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس مکتب کا بنیادی مقصد مذہب اسلام سے اپنے لوگوں کو اپنی ہی زبان میں تعلیم دینا تھا۔ اس مکتب سے کافی علما دین وابستہ تھے جو بلوچی اور براہوئی زبانوں میں قرآن پاک کے ساتھ دیگر مذہبی کتابیں فارسی، عربی اور اردو سے ترجمہ کرتے ہیں۔ قرآن پاک کا پہلا بلوچی ترجمہ مولانا حضور بخش جتوئی نے کیا جسے انہوں نے 1326ھ کو مکمل کیا اور جسے مکتبہ درخانی کی جانب سے 1329 ہجری کو شائع کیا گیا۔ قرآن پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہندوستان اسٹیم پریس لاہور سے چھپی جو 1224 صفحات پر مشتمل ہے اور جسے بلوچی کے مشرقی لہجے میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ مولانا حضور بخش جتوئی نے بلوچی زبان میں اور بھی بہت سی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ سورۃ تبارک الذی، سورۃ یسین، ترغیب الحاج، روضتہ الاحباب، طلب حق، کلمات اکفر، معجزاتِ محمدیہؐ کامل، ناصح المسلمین، نماز مترجم، نماز فرائض، وصیت نامہ، ابویوسف محمد، ھدایت ابدی، اصول الصلواۃ، اربعین اور دیگر شامل ہیں۔

بلوچی زبان میں قرآن پاک کے اور بھی تراجم ہو چکے ہیں جن میں قاضی عبدالصمد سربازی کا قرآن مجید کا بلوچی ترجمہ 1987 میں المیتہ المرکزیہ اِسلامیہ پنجگور کی جانب سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس طرح مولانا خیر محمد ندوی کا 'قرآن شریف بلوچی ترجمہ اور تفسیر، پاک نیوز ایجنسی تربت کیجانب سے 1984ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اسکا دوسرا ایڈیشن ندوی پبلی کیشن کراچی کی جانب سے 2014 میں شائع ہوئی ہے۔ 2020ء میں بلوچی زبان کے جید عالم دین جناب مولانا رحمن سلیمی کی ترجمہ کی گئی قرآن پاک مدرسہ عربیہ دارالھدی پیشکان کی جانب سے شائع ہوئی ہے جو کہ بلوچی کے مکرانی لہجے میں ہے، دیگر تراجم کی نسبت یہ کلام اللہ عربی سے ترجمہ ہوا ہے، اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ انتہائی سلیس و با محاورہ ہے۔ بلوچی زبان کے نامور ادیب سید ہاشمی نے قرآن پاک کی تیسویں پارہ کا ''جزعم بلوچی '' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ سید ہاشمی بھی عربی زبان سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ترجمہ بھی انتہائی سلیس ہے اور روانی کے حساب سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح جمال عبدالناصر نے یسین شریف کا بلوچی

ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی مکرانی لہجے میں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک کا ترجمہ ایرانی بلوچستان سے مولانا عبدالغنی افشانی نے کیا ہے جو زاھدان ایران سے 1429ھ میں شائع ہوا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو بلوچی میں قرآن پاک کے مکمل ترجموں کے ساتھ اس کی بعض آیتوں کا بلوچی میں ترجمہ ہوا ہے۔ بلوچی میں قرآن پاک کے تراجم کے ساتھ تفاسیر بھی لکھی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر جناب مولانا خیر محمد ندوی کی ہے۔ جسے انہوں نے "قرآن شریفءِ بلوچی تفسیر وترجمہ" کے نام سے 1984 میں پاک نیوز ایجنسی تربت کی جانب سے شائع کروایا۔ اسی طرح عبدالغفار رضا زامرانی کی دو جلدوں پر مشتمل قرآن پاک کی تفسیر "بلوچی تفسیر" کے نام سے 2012 میں الجامعہ السلفیۃ داعوۃ الحق کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ مولانا صاحب عربی زبان کے عالم ہیں اور بلوچی پر بھی ان کی گرفت کافی مستحکم ہے۔ ان کی یہ تفسیر بلوچی میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔

5.5 احادیث کے تراجم:

بلوچی زبان میں احادیث کے تراجم کی روایت اتنی زیادہ مستحکم تو نہیں ہے۔ لیکن بہت سے بلوچ عالموں نے حضور پاکؐ کی احادیث کو بلوچی کا جامہ پہنایا ہے۔ اس حوالے سے مولانا خلیل کیازئی جو کہ خود مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہے، انہوں نے خصوصی توجہ سے کام کی ہے۔ اب تک ان کی احادیث شریف کی دو ترجمہ کی ہوئی کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ جس میں "پیگمبرءِ درائینت"۔ یعنی پیغمبر نے فرمایا اور دوسری کتاب "چِل احادیث" یعنی چالیس احادیث کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔ چونکہ مولانا صاحب عربی زبان سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں اس لئے ان کے تراجم کی بلوچی میں کافی اہمیت ہے۔ انہوں نے حضورؐ کی منتخب احادیث کا ترجمہ کیا ہے کچھ احادیث کا ترجمہ بلوچی زبان کے نامور دینی اسکالر مولانا خیر محمد ندوی نے کی ہے جو ان کے زیر ادارت شائع ہونے والی ماہنامہ رسالہ "سوغات" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ جو کہ بیشتر فضائل اعمال کے حصے "زکر و دعا" سے لئے گئے ہیں، انہیں ان کے نواسے جمال عبدالناصر نے مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کافی احادیث کو بلوچی میں ترجمہ کیا ہے مولانا صاحب نے یہ تراجم عربی سے کی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو سلیس اور آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے جو کہ عام قارئین کو پڑھنے اور سمجھنے میں کافی مدد گار ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بلوچی زبان میں احادیث کے ترجموں کا ایک سلسلہ ہمیں مختلف دینی رسائل و جرائد میں بھی نظر آتی ہے۔ مولانا خیر محمد ندوی کا رسالہ سوغات اس حوالے سے ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے

اپنے اس رسالے میں مذہب اسلام سے بلوچ قارئین کو آگاہی دینے کے لئے مختلف اسلامی موضوعات پر مضامین چھاپے ہیں۔ اور اکثر احادیث کے تراجم بھی شامل کیے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ بلوچی زبان میں اسلامی شریعت، تاریخ و شخصیات کے ساتھ ساتھ احادیث شریف کے چھاپنے کا سہرا بھی اسی رسالے کے سر جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا ہے۔ نامور مذہبی اسکالر جناب مولانا عبدالسلام عارف صاحب کے زیر ادارت شائع ہونے والے جرائد ''راستیں راہ'' خصوصی طور پر دینی جریدوں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا صاحب نے اپنے اس جریدے میں مذہب اسلام، قرآن پاک، فقہ احادیث اور دیگر مذہبی موضوعات پر اس جریدے میں کافی کچھ شائع کیا ہے جس میں احادیث کے بھی کافی ترجمے شامل ہیں۔ حافظ اسماعیل بلوچ کے سرپرستی میں شائع ہونے والا جریدہ ''رژن'' بھی اس حوالے سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس جریدے میں بھی احادیث کے تراجم کے ساتھ دیگر شرعی اور اسلامی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

5.6 سیرت رسول ﷺ:

بلوچی زبان میں نثری مضامین و کتاب نویسی کی ابتدائی نقوش وہ ہیں جو مکتبہ درخانی سے ملتی ہیں۔ مولانا حضور بخش جتوئی وہ پہلے صاحبِ ایمان شخص ہیں جنہیں بلوچی زبان کی تاریخ میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے جہاں قرآن مجید کو پہلی بار بلوچی زبان میں منتقل کیا، وہی بلوچی زبان میں سیرت نگاری کی روایت بھی انہیں کی ذات سے منسلک ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بلوچی زبان میں سرور کونین حضرت محمدؐ کی سیرتِ مبارکہ کو پیش کیا۔ ان کی مشہور تصنیف معجزات محمدیہ کامل 1330ھ میں شان سٹیم پریس لاہور سے چھپ کر مکتبہ درخانی ڈھاڈر سے شائع کی گئی۔ یہ کتاب حضرت محمدؐ کے مشہور معجزات سے متعلق ہے۔ اسی صفحات پر مشتمل اس کتب میں شق القمر، حضرت جابر کے بچوں کا زندہ ہونا، دودھ کے پیالے میں برکت، درختوں کا چلنا، پہاڑ کا ابلنا، انگشت مبارک سے پانی کا جاری ہونا اور دیگر معجزات کو انتہائی موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی میں بلوچی زبان میں تخلیق ہونے والی شاعری جو نیم کلاسیکل کہلاتی ہے، جسے مُلائی عہد بھی کہا جاتا ہے۔ اس عہد کی شاعری میں ایک خاص میلان یہ ملتا ہے کہ مذہبی موضوعات کے ساتھ اسلامی واقعات اور داستانیں، حضورؐ کی سیرت و کردار اور دیگر واقعات کو منظوم صورت میں بیان کیا ہے۔ ملا فاضل نے واقعہ معراج کے پس منظر میں ایک خوبصورت نظم کہی ہے، چند اشعار اقتباس کے طور پر پیش ہیں:

آن الف ءَ گشت گوں جیم ءَ تو برو میم ءَ بیار
دوست ءُ عازیز ءُ حبیب ءَ پر منی دیما بدار
تحفہ ءُ وشیں سلاماں من دیان ئے بے شمار
یک دمان ءَ حکم اللہ بوتگ ات جبریل تیار
برتگ ات جبریل امین ءَ سید ءِ عالی تبار

ترجمہ:

الف نے کہا جیم سے
تو جا کے میم کو لے آ
میرے حبیب دوست کو میرے روبرو لے آ
دوں گا اسے تحفہ و اکرام بے شمار
اسی لمحے خدا کے حکم پر ہوا جبریل تیار
جبریل کے ہمسفر تھے سیدِ عالی تبار
سات آسمانیں گزاری قاب قوسین تھا مقام
جا پہنچے سردارِ عالم درِ پروردگار
تحفہ و اکرام ساتھ لائے بے شمار
آن پہنچے مکہ کی پاک سرزمین پر
رات وہی تھی
وقت گزرا تیس سال
خبر ہوئی بی بی کو نہ معراج کی
دوستوں اور چار یاروں کے لئے
بخششیں اپنے ساتھ لائے بے شمار

ملا فاضل سے پہلے ہی مذہبی موضوعات میں شعر کہنے کی روایت موجود تھی۔ نظم کی ابتدا میں حمدیہ و نعتیہ اور منقبت اشعار کہنے کی رواج عام تھی۔ نعتیہ اشعار میں حضورؐ کی صفت و ثنا اور ان کی سیرت و کردار کا تذکرہ عام ملتا ہے۔ جدید بلوچی ادب کی تاریخ انیس سو پچاس کی دہائی میں اپنی تمام تر آب و تاب فکری امنگوں اور جزبوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ جدید بلوچی ادب و زبان کی تاریخ میں مولوی محمد حسین عاجز ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بلوچی زبان میں حضورؐ کی سیرت نگاری پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اومان کے شمارے جنوری 1952 میں" سیرت النبیؐ "کے نام سے ان کا مضمون شائع ہوا۔ سیرت پر ان کی لکھی گئی دیگر مضامین میں "کلماتِ رسولؐ"،" وصیت "قابل ذکر مضامین ہیں جو بلوچی زبان کے اولین ماہنامہ اومان میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ قاضی عبدالرحیم صابر، الجوہر واجہ، حاجی عبدالقیوم، محمد ہدایت اللہ، عنایت اللہ قومی اور ابراہیم عابد نے حضورؐ کی زندگی کے مختلف جہات کو بلوچی زبان میں روشناس کرانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ رسائل میں ماہنامہ اومان کے علاوہ دیگر اہم رسائل میں سے اولس، بلوچی، سوغات اور ماہنامہ بلوچی کوئٹہ ایسے رسائل ہیں جن میں سیرت نگاری کے حوالے سے سینکڑوں مضامین لکھے گئے ہیں جن میں کچھ نئے عہد کے لکھاری بھی شامل ہیں جیسے پیر محمد زبیرانی، صبا دشتیاری، کریم آزات، فضل خالق اور عبدالسلام عارف قابلِ ذکر ہیں۔

سیرت نگاری کو فروغ دینے میں رسائل کے ساتھ ساتھ ادبی انجمنوں کا کردار بھی مثالی رہا ہے، جن میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ اس ادارے کی شائع کردہ کتب میں حاجی عبدالقیوم کی" رسولؐ ءِ پہکیں زند"(حیاتِ طیبہ)میر محمد خان مری کی" پاکیں نبیؐ ءِ زند(رسول کی حیاتِ طیبہ)اور مومن بزدار کی کتاب " دو جہانءِ سردار، محمد رمضان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب "رسول ءِ پیغام "،نصیر شاھین کی" رژنِ شوھاز "روشنی کی تلاش)سیرت نگاری کے حوالے سے اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ان تمام کتب میں حضورؐ کی پیدائش، بچپن، جوانی سے لے کر نبوت اور اس کے بعد کے بیشتر معاملات کو احسن طریقے سے تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے ۔

5.7 سلام:

یہ نظم کی ایک قسم ہے جو زیادہ تر شہداء کربلا کے مدح میں لکھی جاتی ہے۔ مرثیہ کی ایک ذیلی صنف جو ہئیت،

بحر اور تعداد اشعار کے لحاظ سے غزل کا سا انداز رکھتی ہے۔ واقعہ کربلا کے حوالے سے امام حسینؑ، ان کے اقارب اور رفقاء کی شان اور ان کی کیفیت اور قربانی کو محسوس کرے اس کو غزل یا قصیدے کی شکل میں پیش کرنے کو ''سلام'' کہا جاتا ہے۔

بلوچی شاعری میں اس صنف کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہوا ہے لیکن بعد میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے باعث کبھی کبھی ایسے شاعر نظر آتے ہیں، جنہوں نے سلام لکھے ہیں۔ ان میں رزاق نادر اور ڈاکٹر فضل خالق اہم نام ہیں۔ جنہوں نے روایتی نہیں بلکہ زندہ اور مکمل تخلیقی عمل کے تحت سلام لکھے ہیں۔ جس میں امام حسینؑ کے بارے میں بہت سے خیالات دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے اُردو ادب میں کربلا علامت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں اسی علامت کا رنگ رزاق نادر اور فضل خالق کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

خود آزمائی

1۔ بلوچی میں دینی ادب کی روایت کو بیان کریں۔

2۔ بلوچی میں نعتیہ شاعری کی روایت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وضاحت کریں۔

3۔ بلوچی زبان میں قرآن پاک کے تراجم کی روایت اور چند مشہور مترجمین کے نام لکھیں۔

4۔ بلوچی میں احادیث کے تراجم کن کن علماء کرام نے کیے ہیں؟ نام لکھیں۔

6۔ بلوچی میں سیرت نگاری کی روایت کب شروع ہوئی اور ابتدائی سیرت نگار کون کون ہیں؟

یونٹ نمبر:6

بلوچی کے صوفی شاعر

تحریر:ڈاکٹر رحیم بخش مہر
نظر ثانی:ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل:ڈاکٹر حاکم علی برڑو

فہرست

	یونٹ کا تعارف	101
	مقاصد	101
6	بلوچی کے صوفی شاعر	102
6.1	پسِ منظر	102
6.2	جام درک	102
6.3	مست توکلی	104
6.4	جوانسال بگٹی	108
6.5	تاج محمد تاجل	109
	خود آزمائی	110

یونٹ کا تعارف

زیر نظر یونٹ کا موضوع بلوچی کے صوفی شاعر ہیں۔ اس یونٹ میں آپ کو بلوچی زبان میں صوفیانہ شاعری کی روایت کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیگی، جس سے آپ نہ صرف بلوچی میں صوفیانہ شعری روایت سے آگاہ ہوں گے بلکہ آپ کو بلوچی کے منتخب صوفی شعرا کے فن اور کلام کے بارے میں معلومات بھی فراہم کی جائیگی علاوہ ازیں ان کے کلام کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو پڑھنے کے بعد آپ :

۱۔ بلوچی صوفیانہ شاعری کے پس منظر سے آشنا ہوں گے۔

۲۔ بلوچی کے صوفی شعرا کی زندگی کے بارے میں بنیادی معلومات سے آگاہ ہوں گے۔

۳۔ بلوچی صوفیانہ شاعری کے موضوعات پر دسترس ہو گی۔

۴۔ بلوچی صوفیانہ شاعری پر اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔

6۔ بلوچی کے صوفی شاعر

6.1۔ پسِ منظر:

بلوچی زبان میں شاعری کی روایت صدیوں پر مشتمل ہے۔ بلوچی کلاسیکل شاعری اپنے موضوعات اور زبان و بیان کی توانا روایت کی وجہ سے اپنا ایک معیار رکھتی ہے۔ صوفیانہ شاعری کی روایت کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بلوچی میں صوفیانہ شاعری نے اٹھارویں صدی میں رواج پائی ہے، جس کے بنیاد گزار جام درک ہیں۔ ویسے جام درک کی تمام شاعری صوفیانہ تو نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں دیگر موضوعات پر بھی شعر ملتے ہیں، لیکن بلوچی زبان میں معرفت کی باتیں، روحانی تربیت کے رموز، خدا سے رغبت، محبت، یقین، معاشرے کی بدصورتیوں سے نفرت، محبت یگا نگت، بھائی چارے، اخوت اور مساوات کے فروغ کی باتیں ہمیں پہلی دفعہ انہی کے ہاں نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں مٹی سے لگاؤ اور مجبور لاچار بے کس لوگوں کے راز بھی دکھائی دیتی ہیں۔

جام درک کے بعد بلوچی میں صوفیانہ شاعری کی روایت آگے جا کر کافی مستحکم ہوتی نظر آتی ہے اور دیگر بہت سے صوفی شعراء ابھر کر سامنے آتے ہیں جنہوں نے اپنی فکر و نظر اور خیالات کو شعری پیرائے میں بیان کرنے کی لامتناہی جدوجہد کی ہے، ان بلوچ صوفی شعرا کے ہاں خدا اور اس کے رسولؐ سے سچی لگن اور محبت کا درس ملتا ہے۔ صوفیانہ شاعری کی بنیادی خصوصیات میں احترامِ آدمیت کا عنصر نمایاں ہے، حسن اخلاق اور بھلائی کا تصور ان کی شاعری کا منبع رہا ہے۔ بلوچی صوفیانہ شاعری میں بھی ہمیں انہیں خصوصیات کی جھلک صاف نظر آتی ہے، یعنی عشقِ خدا اور حُبِ رسولؐ کا اظہاری پہلو کافی توانا ہے۔ بلوچی زبان میں نمائندہ صوفی شعرا میں سے ہمیں مست توکلی، جام درک، تاج محمد تاجل، صوفی رکھیل شاہ، فیضل فقیر لاشاری، صوفی چیزل شاہ، محمد فقیر لاشاری، صوفی احمد فقیر، جوانسال بگٹی سمیت کئی شعراء کی شاعری نظر آتی ہے جنہوں نے خدا سے محبت، امن و آشتی اور اخوت کے میٹھے بول گا کر عالمِ انسانیت کو بھائی چارے کا درس دیا ہے۔

6.2۔ جام درک:

بلوچ صوفی شاعر جام درک جو کہ ڈومبکی قبیلہ کے سردار کرم خان کے صاحبزادے تھے۔ اٹھارویں صدی

عیسوی کی دوسری دہائی میں 1714ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی طویل زندگی میں انہوں نے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ وہ بہترین شاہسوار، تلوار باز اور شکاری تھے۔ ان کی شاعری ان کے لئے قدرت کا عطیہ تھی اور انہوں نے وقار، مرتبے، خودی اور اعلیٰ ترین عوامل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

جام درک کی شاعری عوام الناس کے لئے شعری عطیہ کے علاوہ صوفیانہ روحانی قوتوں کی حامل بھی نظر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ استغراق کے عالم میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتے وقت دنیا و مافیا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ اور اس عالم بے خودی میں جو شاعری تخلیق کرتے تھے وہ اعلیٰ صوفیانہ اقدار کی حامل ہوا کرتی تھی۔

جام درک کی نظموں میں فی البدیہہ اور رواں طرز اظہار ساحل پر پھیلتی سکڑتی موجوں کی طرح معلوم ہوتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ روحانی تجربوں سے گزر کر وہ بنی نوع انسان کو حقیقت مطلق تک رسائی کا راستہ سمجھا رہے ہیں، انہی خصوصیات کی بناء پر بلوچی زبان میں ان کی شاعری بے حد مقبول ہوئی۔ جام درک ایک وسیع المشرب شاعر ہے، جس کے گیتوں اور نغموں میں سعدی و حافظ کی مستی، عمر خیام کی بے نیازی اور امیر خسرو کا تغزل دلوں کو موہ لیتا ہے۔

میں نے سخن سرائی کی ہے
میں نے موتی پروئے ہیں
میں نے لعل سمیٹے ہیں

بلوچی کلاسیکی شاعری اپنی ہیئت کے حوالے سے نظمیہ شکل میں ہے۔ درک وہ پہلے شاعر ہے جنہوں نے بلوچی شاعری میں تغزل کا رنگ پیدا کیا، گو کے ان کی شاعری بھی اپنی ہیئت کے حوالے سے نظمیہ پیرایے میں ہے لیکن ان کے تغزل کی بلند خیالی ان کی شاعری کو بعض مقامات پر غزل کے قریب لاتی ہے۔

جام درک سے بیشتر بلوچی شاعری کے اظہار کا کینوس اس قدر وسیع نہیں تھا، بس چند ہی اہم موضوعات کے گرد بلوچی میں شعر کہے جاتے تھے۔ جام درک نے بلوچی شاعری کے موضوعاتی پہلو کو وسعت دے کر اس میں عشقِ مجازی کے ساتھ عشقِ حقیقی کا رنگ بھی شامل کیا اور ساتھ ہی فارسی و عربی لفظیات اور محاوروں کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے اچھوتے اور نرالے خیالات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اپنی عوامی ثقافت، روایات اور طرز زندگی کو اپنی شعری تخلیقات میں اس طرح دکھانا کہ وہ حقیقت کے قریب تر نظر آئیں جام درک کا ہی کمال ہے۔ جام درک نے

1784ء میں انتقال فرمایا۔

گوش دارے بیلہاں جام ئے زار ہاں
ایش او ہمیشاں من تی اے گُشاں۔

یعنی

سن لو دوستو! جام کی آہ و زاریاں
یہ سُن لو تو میں اور سناتا جاؤں۔

ہجر مناں مومی اوں جنت پاساں
چو کہیرانی آڑویں آساں۔

یعنی

ہجر نیم شب کو موم کی طرح پگھلائے
جیسے کہیر کی لکڑی آگ کو بھڑکائے۔

موژیں دل منی باغ بیشہ، یک شاخا ہزار بیشہ
ہر شاخا گل بیشہ، گلاں تازغیں رنگ بیشہ۔

یعنی

موجی من باغ باغ ہوا، اک شاخ سے ہزار ہوا
ہر شاخ پر پھول سجے، تازہ رنگوں کا اک بہار ہوا۔

6.3۔ مست توکلی

غیر مستقل دریاؤں، چٹیل میدانوں، ناہموار وادیوں اور برہنہ پہاڑوں سے مرتب سرزمینِ بلوچستان کا شاعر مست توکلی مری قبیلے کی شیرانی شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مانٹرک بند نامی گاؤں کے لال خان نامی ایک عام آدمی کے گھر 1830ء کی دہائی کے اوائل میں پیدا ہوا۔ والدین نے اس کا نام سہراب خان رکھا لیکن بعد میں اس بچے کا نام بدل کر

توکلی رکھ دیا گیا۔

جو ایک بلوچی نام ہے جن کے معنی ہیں توکل کرنے والا، پہل کرنے والا۔ مست کا لقب مستی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی درویشی، دیوانگی اور دنیا سے لاتعلقی کی وجہ سے پڑا اور یہ لفظ مست ان کے اصل نام کا حصہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ سمو بیلی کے نام سے بھی مشہور تھے چونکہ بیل ساتھی کو کہتے ہیں یعنی جڑواں رہنے والے ساتھی، مست سمو کی عشق میں گرفتار تو تھے ہی اس لیے انھوں نے بعض جگہوں پر اپنے لیے سمو بیل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مست کی سمو کے ساتھ عشق کا دور تقریباً 1858ء ہے، توکلی نے اپنا بچپن اور اوائل جوانی کا زمانہ مویشیوں کے ریوڑ چراتے اور سیر و شکار کرتے گزارا۔

مست توکلی اپنی شاعری کے موضوعات کی پھیلاؤ کی وجہ سے ہفت جہت فنکار تھے۔ ان کی شاعری میں عشقِ مجازی کے بیان کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا محور و منبع ویسے تو سموؔ ہے لیکن سمو ان کے ہاں علامتی و استعاراتی روپ لئے ہوئے ہیں۔ سموؔ بظاہر گوشت پوست کا ایک نمونہ ہے مگر مست کے ہاں سمو مختلف پیرایوں میں بیان ہوا ہے۔

لوگ حج کے لئے جارہے ہیں

اور میں سمو کا دیدار کرنے جارہا ہوں

مست توکلی ایک مجذوب شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں فیوڈل سسٹم اور انگریز استعماریت کے خلاف لکھا ہے۔ نو آبادیاتی نظام کا یہ مخالف اپنی شاعری میں نو آبادیاتی نظام کی قباحتوں کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ انہوں نے آپس میں بھائی چارہ، امن، برداشت اور عالمگیر محبت کی بات کی ہے۔

مست کی شاعری کی اہم خصوصیت ان کا سوزِ بیان ہے۔ وہ فطرت کے حسین نظاروں میں کھویا ہوا ایک ایسا شاعر ہے جسے ہر شے میں اپنا محبوب نظر آتا ہے، وہ جو کچھ بھی شعری پیرائے میں بیان کرتا ہے تو اس میں ان کی تڑپتی ہوئی روح کی پکار سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اس زمانے کے رائج میلان یعنی فارسی اور عربی شاعری اور لفظ و محاورے کے بدلے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات، بلند و بالا پہاڑ، گھنی سایہ دار درخت، رنگ برنگے پھول اور فطرت کے بے کنار نظاروں کو تشبیہ و استعارے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مست توکلی بلوچی کے وہ صوفی شاعر ہیں جسے قدرت کی بنائی ہوئی کائنات سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی شاعری میں جو سوز و گداز دکھائی

دیتی ہے وہ ان کی عاجزانہ طبیعت اور درد مند دل رکھنے کے سبب ہے۔

مست توکلی کی شاعری میں صوفیانہ رنگ بھی نمایاں ہے وہ عالمِ سرمستی میں عشق کے رموز و اسرار کو روزمرہ زبان میں انتہائی سلیس پیرائے میں بیان کرتا ہے، یوں وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، بُلھّے شاہ، رحمٰن بابا اور وارث شاہ جیسے شاعروں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے۔

اے خدا تو ہے واحد و یکتا
ہے یہ شاہی فقط تجھے زیبا
تو اگر قہر پہ اتر آئے
تیری سطوت کا ہی رہے چرچا
اور اگر رحمتوں پر مائل ہو
کوئی مشفق نہیں تیرے جیسا
قہر و رحمت پہ قادر، اے ستار
میرا مقصد ہے بس تیرا جلوا
جب قیامت کی آئے گی ساعت
دید سے اپنی بہرہ ور فرما

مست نے زندگی بھر جنگ سے نفرت اور امن سے محبت کی۔ وہ انسانوں کو ترقی اور خوشحالی کے لیے امن کو ضروری سمجھتے تھے ان کے خیال میں امن تمام منفی قدروں کا مخالف اور تمام مثبت قدروں کا حامی ہے۔ وہ امن کے ذریعے برائیوں کو ختم کرنے اور اچھائیوں کو پروان چڑھانے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ ایک دفعہ جب دو بلوچ قبیلوں میں جنگ کی بات ہو رہی تھی تو جنگی حالات اور لوگوں کی تکلیفوں کی مست نے اپنی شاعری میں کمال تصویر کشی کی ہے۔

ترجمہ:

ہمارے دل میں قرآن حکیم کے حروف فروزاں ہیں
میرے پاس صحف آسمانی کے اوراق کا ایک پرزہ ہے
جنگ و جدل کی بے ہودہ باتیں اچھی نہیں

کون اپنے پیاروں کو دربدر رکھ سکتا ہے

ایک جگہ وہ سموجوان کی عشق ہے، کے بارے میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

زُرتغاں بُواں، بوئے چوہُمبوئی زراں

جان ساڑت بیثہ، اِشتغاں پہناذ سُمبغاں

یعنی۔

خوشبوئیں مہک سی اٹھیں، شدت سے معطر کرنے لگیں

روح کو تسکین پہنچی، پہلو سے ابھرتی ہوئی ٹیسیں رُک گئیں۔

سموگُٹ گوں بُرگڑی آں، پُونز گوں پُلڑی آں

سَر گوں چُنڑی، پاذ گوں جُتڑی، جِندماں کڑی آں۔

یعنی۔

سَمو کے گلے میں ہار ہوں، ناک میں نتھلی ہو

سر پر چادر، پاؤں میں جوتی اور اس کا اپنا گھر ہو

وہ جب جذب و کشف کی حالت میں آتا ہے تو اپنے عام اسلوب سے ہٹ کر کائنات اور رموز ہستی سے اس طرح پردہ اُٹھاتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ شخص کوہستانوں میں بھٹکنے والا ایک اَن پڑھ چرواہا ہے۔ مست توکلی کے کلام میں جو عرفان موجود ہے وہ اس کی ابیات میں موجود ہے۔ ایک کا مفہوم کُچھ یوں ہے:

"موتی خاک اور دوسری چیزوں پر نہیں چمکتا، اسے سیاہ چادر پر ڈال کر پرکھا جاتا ہے۔

انسان ازل سے جو صلاحتیں لایا ہے

وہ موتی کی طرح تابناک ہیں، اس مادی دنیا کی تحریص و طلب

اعمال سیاہ بن کر ان صلاحیتوں کے لئے امتحان کا باعث بنتے ہیں۔"

مست کی شاعری میں فطرت نگاری کا عنصر کافی نمایاں ہے، وہ چونکہ خود بھی فطرت کے نزدیک رہے ہیں اور اس کا مشاہدہ اس حوالے سے کافی دیدنی ہے، وہ انسانی زندگی کو فطرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کی شاعری میں بیشتر

تشبیہات اور استعارے بھی عین فطرت کے مطابق ہیں۔ چونکہ وہ اس کائنات کو اس عظیم ہستی کی تخلیق مانتے تھے اس لئے انہیں اس کائنات میں پھیلی ہر اک شے میں خدا کا عکس نظر آتا تھا۔

6.4۔ جوانسال بگٹی

جوانسال بگٹی بلوچی زبان کے ایک پر فکر اور قادر الکلام سخنور، حسین قدروں کے دلدادہ اور درس اخلاق کے ایک معروف معلم وصوفی شاعر تھے۔ جوانسال 1885ء کو بلوچستان کے شہر سوئی کے گاؤں کھٹن میں تھنگئی (نور محمد) کے گھر پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام جوانسال رکھا۔

پسماندگی کے سبب آپ اسکول، کالج یا مدرسے میں علم کے زیور سے آراستہ تو نہ ہو سکے، تاہم الہامی طور پر علم و فکر اور اپنے نیک سیرت والد کی صحبت اور پیغمبری پیشہ چرواہا گری میں قدرت کے نظاروں اور پہاڑوں وبیابانوں میں فطرت کے حسن سے متاثر ہو کر شاعری کی جانب گامزن ہوئے۔ روایتی تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اسلام کے مبلغ اور سماجی زندگی سے باخبر مصلح کے طور پر ان کے کلام میں اخلاقی شاعری تصوف کے قریب تر ہے۔

جّوانسال بگٹی کی شاعری میں حمد و نعت، حسن و عظمت کے علاوہ بلوچی اخلاقی قدروں کی پاسداری کی تلقین وہدایات واضح انداز میں چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں۔ عرصہ دراز سے عشقِ حقیقی میں مبتلا جنگلوں اور بیابانوں میں شاعری کرتے رہے۔ اپنے علاقے میں مال مویشی سے شوق رکھتے ہوئے کبھی کسی میٹروپولٹین و شہری زندگی کا رخ نہیں کیا۔ البتہ اس دور میں برٹش دور کے انگریز حکمران نے باباجّوانسال بگٹی کو اپنی جانب گامزن کرنے کے لیے بڑے حیلے وسیلے کیے۔ تاہم باباجّوانسال بگٹی نے اپنی وطن دوستی، علاقے کے عوامی مسائل اور سب سے اہم بات یہ کہ وہاں کے باسیوں سے محبت کرتے ہوئے کبھی کسی اعلیٰ حکام یا نواب و سردار کے دربار میں درباری نہ بنے۔ حالاں کہ تجربات و مشاہدات کے مطابق عشق مجازی سے ہوتے ہوئے عشق حقیقی کا سفر کیا جاتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے باباجّوانسال بڑے خوش نصیب ہیں کہ وہ ایک سمت میں سفر کر کے شاعری جیسی نعمت سے نوازے گئے۔ ان کی زندگی میں کوئی سمو بیلی، حرمت بی بی، ہیر اور سسی نہیں آئی۔ سیدھا اللہ تعالیٰ سے عشق اور رسول اللہ سے محبت نے ان کے اندر میں ہل چل مچادی اور وہ بلوچی زبان میں بے تحاشا شاعری کرنے پر اتر آئے۔ بابا کی تمام شاعری حمد و نعت، انسانی خدمت اور قدرت کی نعمتوں پر مشتمل ہے۔ باباجوانسال کی شاعری چھوٹے بیٹے قاری نور محمد نے باباجّوانسال کے زبان سے سن کر تحریر کر کے بلوچی کلام پہ مشتمل کتاب شائع کروائی ہے۔ ڈیرہ بگٹی میں اپنی مادری زبان مشرقی بلوچی میں عشق حقیقی میں مبتلا ہو کر شاعری کرنے والے جوانسال بگٹی شاہ لطیف بھٹائی، مولانا رومی اور خواجہ غلام فرید کے قافلے کے سچے سپاہی ہیں۔

نیم غریبی حال وچال ایں
نیم غنی اوزروال ایں۔۔

ترجمہ

آدھے غربت کے مارے بے بس ہیں
آدھے امارت کے مارے فضول خرچ ہیں۔
چِکریں حرِصان آکنئے بندا
مال پرائی ایں بندئے مس تندا۔

ترجمہ

اتناہوس کے آڑے آتاہے تواے بندا
پرائے مال پر نظر گاڑھناہے شیطان کادھندا

ترجمہ

اے رب تعالیٰ میں نے بے شمار دکھی انسان دیکھے ہیں
جیسے ریل کے ڈبے مسافروں سے بھرے ہوتے ہیں
وہ دکھی لوگ دکھ کی پروئی چھنکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں
مصیبتوں کے جولانوں کی جھنکار بھی ساتھ ساتھ سنائی دیتی ہے
اے انسانو! یہ سب تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے
تمہاری بری عادتوں اور افعالِ بد کا ثمر ہے

6.5۔ تاج محمد تاجل:

تاج محمد تاجل جسے شاعرِ ہفت زبان بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ساتھ زبانوں میں اشعار کہے ہیں جن میں بلوچی، براہوئی، سندھی، سرائیکی، فارسی، اردو اور عربی زبانیں شامل ہیں۔ تاج محمد تاجل براہوئی زبان کے پہلے صوفی شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ 1833 کو بھاگ ضلع کچھی میں پیدا ہوئے ان کے والد گرامی کا نام فقیر محمد صادق تھا۔

صوفیا کرام نے ہر وقت مہر و محبت، امن و ایمنی اور انسانیت کا درس دیا ہے۔ خیر و سلامتی، خوش و خوشحالی کے پیغامات دیئے ہیں۔ انسانوں کے درمیان اخوت و بھائی چارگی، انصاف، عدل، احترام کا پیغام دیا ہے۔ دنیا کے دیگر صوفیا کی طرح تاج محمد تاجل نے بھی اپنی شاعری میں مہر و محبت، خیر و سلامتی، خوشحالی، عدل و انصاف، توحید و رسالت اور

انسانی خدمت کا پیغام دیا ہے۔ تاجل کی شاعری جو سات زبانوں میں تخلیق ہوئی ہے پُر اثر شاعری ہے۔ تاجل کی شاعری میں خیال کی بلندی، فکر و فن کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ تاجل کی فکر کی بنیاد تصوف ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں خدا شناسی کا عنصر نمایاں ہے۔ تاجل صرف بلوچی اور براہوئی بولنے والوں کے لئے اشعار نہیں کہتا بلکہ ان کی شاعری تمام عالمِ انسانیت کے لئے مشعل راہ ہیں۔

انہوں نے اپنے فکر کی بنیاد توحید و رسالت پر رکھی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی ثناو توصیف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا کہ ایمان کی بنیاد نبی پاکؐ سے سچی محبت میں پنہاں ہے۔

عشق چوں گنوخیں چہ کار کئیلی
شف روچ گرداں منا آرام نئیلی۔
یعنی
عشق تو پاگل ہے نکما بنا کے چھوڑتا ہے
میں بے سکونی میں شب و روز دوڑتا ہوں۔
دل آہر کس ءِ ایشیں کہ خدا تو منی
رحم ءِ تہ گیجیت کہ مومن کنی۔
یعنی
ہر اک کے دل میں ہے دعا اے میرے خدا
رحم ڈال کر دل میں اس کے تو مومن بنا

خود آزمائی

1. بلوچی میں صوفیانہ شاعری کی روایت کا مختصر جائزہ پیش کریں۔
2. جام درک کے کلام میں صوفیانہ فکر کے نمایاں پہلو کیا ہیں؟
3. مست توکلی کی شاعری میں عشق اور درد کا اظہار کیسے کیا گیا ہے؟
4. جوانسال بگٹی کی شاعری کی انفرادیت کیا ہے؟
5. تاج محمد تاجل کی شاعری میں روحانیت کی جھلک کیسے نظر آتی ہے؟

یونٹ نمبر7:

جدید بلوچی شاعری

تحریر: ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل: پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

فہرست

یونٹ کا تعارف		113
مقاصد		113
7	جدید بلوچی شاعری	114
7.1	پس منظر	114
7.2	میر گل خان نصیر	115
7.3	آزات جمالدینی	118
7.4	سید ظہور شاہ ہاشمی	121
7.5	مراد ساحر	124
7.6	عطا شاد	126
7.7	اکبر بارکزئی	128
7.8	بشیر بیدار	132
7.9	اللہ بشک بزدار	133
7.10	مبارک قاضی	135
خود آزمائی		138

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

جدید بلوچی شاعری بیسویں صدی کے وسط میں بلوچی ادب کے افق پر ایک نئی اور منفرد شناخت کے ساتھ ابھری۔ اس نے اپنی کلاسیکی بنیادوں کو برقرار رکھتے ہوئے عصری تقاضوں اور جدید رجحانات کو خوش اسلوبی سے اپنایا۔ یہ شاعری محض جمالیاتی اظہار تک محدود نہ رہی، بلکہ محبت، سیاست، ترقی پسندی، سماجی مسائل اور ثقافتی شناخت جیسے اہم موضوعات کو اپنی تخلیقی روایت کا حصہ بنایا۔ جدید بلوچی شاعری کی شناخت ان شعرا کے کلام سے ہوتی ہے، جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف بلوچی زبان کے دامن کو وسعت دی بلکہ قومی شعور کو بیدار کرنے اور سماجی تبدیلیوں کی مؤثر عکاسی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس یونٹ میں آپ جدید بلوچی شاعری کے ارتقا، اس کے نمایاں شعرا اور ان کی ادبی خدمات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ میر گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، عطا شاد، اللہ بخش بزدار، بشیر بیدار، مبارک قاضی، اکبر بارک زئی اور مراد ساحر جیسے اہم شعرا کی تخلیقات اس یونٹ کا حصہ ہیں، تاکہ آپ جدید بلوچی شاعری کے فکری وفنی پہلوؤں کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جدید بلوچی شاعری کی ترقی و ترویج میں کئی نامور شعرا نے اہم کردار ادا کیا ہے، تاہم اس یونٹ میں چند منتخب اور نمایاں شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ یونٹ آپ کو جدید بلوچی شاعری کی گہرائی اور اس کے اثرات کو سمجھنے میں مدد فراہم کرے گا۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ:

1. جدید بلوچی شاعری کے تاریخی پس منظر اور ارتقاء کو جامع انداز میں سمجھ سکیں گے۔
2. جدید بلوچی شاعری کے چند نمایاں شعرا کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
3. جدید بلوچی شاعری میں پیش کیے گئے موضوعات اور ان کی عصری اہمیت کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کریں گے۔
4. بلوچی زبان وادب کے فروغ اور قومی شعور کی تشکیل میں شاعری کے کردار کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔
5. بلوچی شاعری کے ذریعے بلوچی ثقافت، سماجی تبدیلیوں، عصری رجحانات کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

7۔ جدید بلوچی شاعری

7.1 پس منظر:

جدید بلوچی شاعری کا باقاعدہ آغاز قیامِ پاکستان سے چند سال قبل ہوا، جب برصغیر میں آزادی کی تحریک نے عوام کے اندر حقوق کی جدوجہد کا شعور بیدار کیا۔ بلوچ قوم، جو اپنی منفرد تہذیب، زبان اور ثقافت کے لیے معروف تھی، اس تحریک سے متاثر ہو کر اپنی زبان و ادب کو آزادی، مساوات، اور قومی شعور کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں مصروف ہوئی۔ بلوچی شاعری کا جدید رجحان انقلابی فکر اور سیاسی شعور کی علامت بن کر سامنے آیا، جس میں سامراجی تسلط کے خلاف جدوجہد اور عوامی مسائل کی تصویر کشی نمایاں تھی۔

جدید بلوچی شاعری کے سرخیل میر گل خان نصیر ہیں، جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قومی بیداری کا پیغام دیا۔ ان کے ساتھ آزاد جمالدینی، سید ظہور شاہ ہاشمی، مراد ساحر، عطا شاد، اکبر بارکزئی، محمد حسین عنقا، ملک طوقی، بشیر بیدار، اور اللہ بخش بزدار جیسے شعرا نے بلوچی ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ ان شعرا کی تخلیقات میں روایتی عاشقانہ موضوعات کے بجائے زندگی کی تلخ حقیقتوں، سیاسی استحصال، اور سماجی ناانصافی کے خلاف پکار سنائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں دل گداز نعرے اور اجتماعی دکھ و کرب کی گونج محسوس کی جاسکتی ہے، جو ان کے وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کا عکاس ہے۔

جدید بلوچی شاعری میں چھ بڑی لہریں نظر آتی ہیں، جو بلوچی ادب کی ارتقائی منازل کو واضح کرتی ہیں۔ پہلی لہر پاکستان کے قیام سے قبل انگریزی استعماریت کے خلاف مزاحمت کے نتیجے میں وطن دوستی اور قوم پرستی کے فکری مظہر کے طور پر ابھری۔ دوسری لہر سیاسی اور اقتصادی محرومی اور خارجی دباؤ کے نتیجے میں بلوچی ادب میں احتجاج اور مزاحمت کی صورت میں سامنے آئی۔ تیسری لہر 1988 کے بعد قوم پرست تحریک کے انتشار کے نتیجے میں پیدا ہوئی، جس میں سیاسی قیادت کے خلاف مایوسی اور بیزاری کے جذبات نمایاں تھے۔ چوتھی اور پانچویں لہریں عالمی طرز احساس اور امید و رجائیت کی نمائندہ ہیں، جو جدید بلوچی شاعری کے مستقل اور پائیدار مظہر ہیں۔ چھٹی اور آخری لہر بلوچستان کے سیاسی، سماجی، اور معاشرتی انتشار کے نتیجے میں نمودار ہوئی، جس نے نوجوان نسل کے شعرا کو ذات کی گہرائیوں میں جھانکنے پر مجبور کیا اور اس کے نتیجے میں نئے موضوعات اور اسلوب پیدا ہوئے۔

بلوچ شعرا کی مقبولیت ہمیشہ ان کے کلام میں بلوچ، بلوچی، اور بلوچیت کی موجودگی سے مشروط رہی ہے۔ ان کی شاعری اگر زمین زادوں کی محبت، ان کے مسائل، اور ان کی پکار کو اجاگر نہیں کرتی تو وہ عوامی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ میر گل خان نصیر اور ان کے ہم عصروں کی شاعری نے نہ صرف سامراجی تسلط کے خلاف شعور اجاگر کیا بلکہ بلوچی زبان کو ایک مضبوط ادبی اور فکری بنیاد فراہم کی۔

قیام پاکستان کے بعد جدید بلوچی شاعری نے اپنے دائرہ کار کو وسعت دی اور اس میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، اور فطری موضوعات شامل ہوئے۔ شعرا نے اپنی تخلیقات میں الفاظ کی خوبصورتی، استعارات کی جدت، اور تخیل کی بلندی کے ذریعے بلوچی زبان کو ادبی معیار کی نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان کے کلام میں محبت، انسانی جذبات، اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ بلوچ عوام کی زندگی کے دکھ اور امیدوں کی عکاسی بھی شامل ہے۔ یہ شاعری نہ صرف بلوچی زبان و ادب کو عالمی سطح پر منفرد حیثیت دیتی ہے بلکہ اسے عوامی جذبات کا حقیقی ترجمان بھی بناتی ہے۔

جدید بلوچی شاعری نے بلوچی زبان کو نہ صرف ایک علمی اور ادبی شناخت فراہم کی بلکہ اسے عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس شاعری نے بلوچ قوم کے مسائل، خوابوں، اور امیدوں کو محفوظ کیا اور ان میں ایک نئی توانائی پیدا کی۔ آج بلوچی شاعری ان تمام رجحانات کی روشنی میں مسلسل ترقی کر رہی ہے، اور آنے والے وقتوں میں اس کے افق مزید روشن ہونے کی توقع ہے۔ یہ شاعری بلوچ عوام کی اجتماعی روح، ان کی تاریخ، اور ان کے ثقافتی ورثے کی ایک زندہ تصویر ہے۔

7.2 میر گل خان نصیر:

میر گل خان نصیر جدید بلوچی شاعری کے بانی اور ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، جنہوں نے ادب، سیاست، تحقیق، اور سماجی شعور کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ بلوچ قوم کے فرد اور بلوچی زبان کے عظیم شاعر تھے۔ 14 مئی 1914 کو بلوچستان کے ضلع نوشکی کے کلی مینگل میں پیدا ہونے والے میر گل خان نصیر نے ابتدائی تعلیم نوشکی میں حاصل کی اور بعد ازاں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا، مگر صحت کی خرابی کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے اور کوئٹہ واپس آ گئے۔ ان کی شخصیت بلوچی زبان و ادب کے فروغ، سماجی انصاف کے قیام، اور قومی شعور کی بیداری کی علامت تھی۔

میر گل خان نصیر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو شاعری سے کیا، جس میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، اور مولانا الطاف حسین حالی کے اثرات نمایاں تھے۔ ان کی اردو شاعری قومی و اصلاحی رنگ لیے ہوئے تھی، جس میں سامراجی تسلط کے خلاف جدوجہد اور قوم کی بیداری کا پیغام دیا گیا۔ 1942 میں انہوں نے بلوچی زبان میں شاعری کا آغاز کیا اور اس زبان کو ایک نئی فکری جہت عطا کی۔ بلوچی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب انہیں خدائی خدمتگار تحریک کے سربراہ خان عبدالغفار خان کی دعوت پر چارسدہ بلایا گیا، جہاں انہوں نے اپنی پہلی بلوچی نظم بیاو بلوچ پیش کی۔ یہ نظم بلوچی شاعری کے لیے ایک انقلابی پیغام اور بلوچ قوم کے لیے امید کا استعارہ تھی۔

ان کا پہلا بلوچی شعری مجموعہ گلبانگ 1951 میں شائع ہوا، جسے جدید بلوچی شاعری کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری حقیقت پسندی، سماجی انصاف، طبقاتی استحصال کے خاتمے، اور انسانی عظمت جیسے موضوعات پر مبنی ہے۔ ان کے اشعار مظلوموں کی آواز اور ظالموں کے خلاف احتجاج ہیں۔ انہوں نے بلوچی شاعری کو روایتی رومانوی انداز سے نکال کر عوامی مسائل، قومی شعور، اور عوامی جدوجہد کا آئینہ بنایا۔ ان کے کلام نے بلوچی ادب کو نہ صرف موضوعاتی وسعت دی بلکہ اسے فکری بنیاد بھی فراہم کی۔

میر گل خان نصیر کی شاعری ترقی پسند خیالات کی نمائندہ ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے سماجی و طبقاتی جبر کے خلاف احتجاج کیا اور مظلوم طبقے کو بیداری کا پیغام دیا۔ ان کا کلام بلوچ قوم کی حالت زار، ان کی جدوجہد، اور ان کے روشن مستقبل کے خواب کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی شعور، قومی یکجہتی، اور انسانی عظمت کے گہرے نقوش ہیں، جو بلوچی زبان و ادب کو ایک نئی بلندی پر لے گئے۔

میر گل خان نصیر کی سیاسی زندگی ان کی ادبی زندگی کی طرح اصولوں پر مبنی تھی۔ 1972 میں وہ سردار عطااللہ مینگل کی حکومت میں سینئر وزیر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے، جہاں انہوں نے تعلیم کے فروغ اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے نمایاں اقدامات کیے۔ انہوں نے ہمیشہ سرداری نظام، نوآبادیاتی تسلط، اور طبقاتی جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی سیاست عوام کی خدمت اور سماجی انصاف کے قیام پر مرکوز تھی، اور انہوں نے بلوچ عوام کو ظلم و جبر کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی۔

میر گل خان نصیر کی ادبی خدمات بے مثال ہیں۔ ان کی 23 سے زیادہ کتابیں تاریخ، تحقیق، صحافت، شاعری، اور زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی نمایاں کتب میں گلبانگ، شب گروک، دوستین

وشیرین، حمل جیند، گرند، بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچی عشقیہ شاعری، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں، اور پرنگ شامل ہیں۔ ان کے تمام شعری مجموعوں کو بلوچی اکیڈمی نے یکجا کر کے "تیر گال کاریت" کے عنوان سے شائع کیا، جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جامع عکس ہیں۔ ان کی تخلیقات بلوچی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ بلوچ قوم کی تاریخ، ثقافت، اور سماجی شعور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں میر گل خان نصیر کینسر کے مہلک مرض کا شکار ہو گئے، لیکن ان کے عزم و حوصلے میں کوئی کمی نہ آئی۔ 6 دسمبر 1983 کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی زندگی اصول پسندی، انسان دوستی، اور قربانی کی روشن مثال تھی۔ ان کے افکار، نظریات، اور تخلیقات آج بھی بلوچی ادب و ثقافت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ میر گل خان نصیر کا نام بلوچی زبان وادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ان کی تخلیقات آنے والی نسلوں کو سماجی انصاف، قومی شعور، اور انسانی عظمت کا درس دیتی رہیں گی۔

حصارِ زندان

یہ سر بفلک قلعے یہ سنگ و آہن کی دیواریں
تنگ و تاریک دیوار و در اور یہ کھنکتی زنجیر
کہ انسان کو پابہ جولاں نہیں کر سکتے
ہر عہد کے آمر و فرعونوں نے
قدم قدم پر قتل گاہیں اور زندان بنائے تھے
مگر سچ کی گواہی دینے والوں نے
حرمت لفظ کے پاسداروں نے
فصیلِ جسم پر زنجیریں سجا کر
قتل گاہوں کو روند ڈالا تھا
شعور تو روشنی ہے
جسے پس زندان نہیں کیا جا سکتا
یہ امید کی وہ کرن ہے

جو شکستہ دلوں اور خستہ جانوں کے حوصلے بڑھاتی ہے
یہ سچ کہ موت کے سوداگروں اور لہوں فروشوں نے
جابر و آمر اور اپنے عہد کے خداؤں نے
اپنی جھوٹی جاہ و چسم کے بل بوتے پر
سروں کے مینار سجائے تھے
جمہور پر ستم کے پہاڑ ڈھائے تھے
مگر حریتِ فکر کو قتل نہیں کیا جا سکتا
شعور کو رسرنگوں نہیں کیا جا سکتا

(ترجمہ: واحد بخش بزدار)

7.3 آزات جمالدینی

آزات جمالدینی 1912ء میں بلوچستان کے علاقے نوشکی میں پیدا ہوئے ان کا اصل نام عبدالواحد آزاد جمالدینی ہے۔ آپ نے 1956ء میں بلوچی کا دوسرا رسالہ "بلوچی" کا اجرا کیا اور نہایت اہتمام کے ساتھ دو سال تک تمام نامساعد حالات میں اس کی اشاعت کرتے رہے۔ وہ جدید بلوچی شاعری کی تاریخ میں ایک اہم جدت پسند اور رجحان ساز شاعر کے طور پر ابھرے، جنہوں نے نہ صرف آزاد نظم کو بلوچی شاعری میں متعارف کرایا بلکہ اپنے منفرد اسلوب اور احساس کی گہرائی سے اسے ایک نیا لہجہ اور معنویت عطا کی۔ آزات جمالدینی کی شاعری نے روایتی اسلوب سے ہٹ کر داخلی اور خارجی عوامل کا ایک منفرد امتزاج پیش کیا۔

یہ وہ عہد تھا جب سماجی اور سیاسی تحرک کی ابتدا ہو رہی تھی، جس کے زیر اثر شاعری میں داخلی کیفیات کی بجائے خارجی موضوعات کو زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ میر گل خان نصیر کی طرح اسی دور میں آزات جمالدینی نے بھی نظم کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا، لیکن ان کا اندازِ بیان اور موضوعات کی نوعیت منفرد تھی۔

آزات جمالدینی کی شاعری نے اپنے عہد کے مسائل کو نہایت سادگی اور سچائی سے بیان کیا۔ ان کی نظموں میں خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی احساسات اور ذاتی تجربات کو بھی جگہ ملی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "مستیں

توار"(للکار)1953 میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اپنی تازگی، سادگی، اور خلوص کے باعث جدید بلوچی شاعری میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ آزات جمالدینی نے اپنے اشعار کے ذریعے نہ صرف بلوچ عوام کے جذبات کی عکاسی کی بلکہ ان کی محرومیوں اور جدوجہد کو بھی اجاگر کیا۔

آزات جمالدینی کا نظریہ فن واضح اور انسان دوست ہے۔ وہ شاعری کو سیاسی اور سماجی تبدیلی کا ذریعہ سمجھتے تھے اورانھوں نے ہمیشہ غریب عوام کی حمایت میں لکھا۔ ان کے نزدیک انسان کسی ماورائی تصور کا حصہ نہیں بلکہ ایک حقیقی اور عملی حقیقت ہے۔ ان کی شاعری عام زبان اور ہلکی پھلکی بحروں میں لکھی گئی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ما امن لوٹیں (ہم امن چاہتے ہیں) اور سنگتیں دوست بیتگاں (دوستی اور بھائی چارہ قائم کریں) نے اپنے عہد کی عوامی مشکلات اور خواہشات کو گہری فنکارانہ انداز میں پیش کیاہے۔

آزات جمالدینی کا دوسرا مجموعہ کلام رژن (1985) ان کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوا۔ اس میں مستیں توار کی نظموں کے علاوہ ان کی بعد کی شاعری کا انتخاب شامل ہے۔ اگرچہ ان کا بیشتر کلام خلیج کے سفر کے دوران گم ہو گیا، لیکن رژن موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی فکری اور تخلیقی پختگی کا مظہر ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے علامتی اور استعاراتی پیرایہ اظہار کو اپنایا، جو ان کے تخلیقی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی نظمیں انار دانگ، دوشی جہنائی، مہرک اور پرندوشی وغیرہ میں داخلی احساسات کو خارجی موضوعات کے ساتھ نہایت فنکارانہ طور پر پیش کیا گیاہے۔

آزات جمالدینی بنیادی طور پر انسان دوستی کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی شاعری ظلم، جبر، نابرابری، اور استحصال کے خلاف ایک مضبوط احتجاج ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے علمبردار تھے جہاں انصاف، برابری، امن، اور آزادی میسر ہو۔ ان کی نظم پوریا گر (مزدور) سرمایہ اور محنت کی جنگ کو بیان کرتی ہے اور استحصالی نظام کی شدید مذمت کرتی ہے۔ آزات جمالدینی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بلوچی زبان اور ادب کو وہ شعوری بنیاد فراہم کی، جس پر جدید بلوچی ادب کی عمارت تعمیر ہوئی۔ آزات جمالدینی نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت، محبت، اور آزادی کے پیغام کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا، جو آج بھی بلوچی شاعری کا سرمایہ افتخار ہے۔ انہوں نے 5 ستمبر 1981ء کو وفات پائی۔

عنوان: بولی

چلے ہیں ششدر و حیران
نکل پڑے ہیں چلو اب ساتھیو!
عزمِ سفر کر لیں
کسی نیلام گاہ کا رخ کر لیں
بیچ ڈالیں
اپنا جو سب کچھ ہے
بیچ ڈالیں
آباؤ و جداد کی میراث دولت کو
اس سیہ بخت ویراں بے صبح دن کو
بیچ ڈالیں
اس خانماں برباد ہستی کو
ان تیرہ بخت سالوں کو
ماہ و دن کو
کہ ہمارے معصوم پھول سے بچے
منہ بھر نوالے کے لئے ترس گئے ہیں
بیچ ڈالیں
سبھی اسباب و ساماں کو
اس بے ثمر بے کیف گذراں کو
اپنی ہست و نیست کے سارے امکاں کو
اے انسانو!
انسانوں کے فرزندو!

کچھ تو قیمت دو
ایک، دو، دس!
کیا کوئی ہے جی دار؟
جو خریدنا چاہے
میری زندگی بھر کے اثاثے کو
جو میرا ہی مقدر ہے
نہیں۔۔۔۔۔!
کوئی ایسا نہیں جی دار!
جو میری اس متاع بے ثمر کی
کوئی قیمت دے
سراپا کرم خوردہ
متاع بے ثمر کی
کوئی قیمت دے

(ترجمہ: آزات جمالدینی)

7.4 سید ظہور شاہ ہاشمی:

سید ظہور شاہ ہاشمی ولد سید محمد شاہ بلوچی زبان و ادب کے نمایاں ترین ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ 21 اپریل 1926 کو گوادر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بلوچی زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے وقف کیا اور اسے علمی اور ادبی بنیادوں پر مضبوط بنانے کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ شاعری کے حوالے سے ظہور شاہ ہاشمی ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں شعوری طور پر خالص بلوچی زبان و بیان اور علامتوں کا استعمال کیا اور بلوچی شعری مزاج کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تکنیک اور الفاظ و تراکیب کے حوالے سے ایک نئے رجحان کو فروغ دیا گیا اور بلوچی زبان کے قدیم اور متروک الفاظ کو بازیافت کر کے اپنی شاعری میں جگہ دی، جس سے ان کی تخلیقات کئی تنوع سے عبارت ہوئیں۔

ظہور شاہ ہاشمی کی تخلیقات میں پانچ شعری مجموعے شامل ہیں، جن میں ان کی شاعری کا فکری تنوع اور جدت نمایاں ہے۔ انہوں نے بلوچی زبان و ادب کی تاریخ پر تحقیقی کام کیا اور بلوچی رسم الخط اور اصولِ املا کے حوالے سے اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی مشہور کتاب بلوچی سیاہگ راست نبیسہگ بلوچی رسم الخط اور املا پر ایک جامع تحریر ہے۔ انہوں نے بلوچی افسانوں اور انشائیہ مضامین پر بھی عمدہ کام کیا، جس میں ان کی تحریریں بلوچی زبان کی ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کا مختصر ناول میر گند اور بلوچی ادب کا شاہکار اور پبلر ناول نازک بھی ان کے تخلیقی کارناموں کا حصہ ہیں۔ مزید برآں، انہوں نے قرآن پاک کے آخری پارے کا بلوچی زبان میں ترجمہ کیا، جسے بلوچی دینی ادب میں ایک اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ذاتی خطوط کا مجموعہ بھی ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تاہم، ان کا سب سے اہم اور یادگار کام سید گنج کے نام سے بلوچی لغت کی تدوین ہے۔ یہ لغت بلوچی زبان کا پہلا جامع اور مستند لغت ہے، جسے زبان کی لغوی تاریخ کا سنگِ میل قرار دیا جاتا ہے۔

سید ظہور شاہ ہاشمی نے اپنی تخلیقات، تحقیق اور لغت نویسی کے ذریعے بلوچی زبان کو علمی اور ادبی بنیاد فراہم کی۔ ان کا نام ہمیشہ بلوچی زبان و ادب کے لیے خدمات انجام دینے والے عظیم شخصیات میں شامل رہے گا۔ سید ظہور شاہ ہاشمی نے نظمیں بھی تخلیق کیں، لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر کے طور پر زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ بلوچی غزل کی آبیاری، ترقی، اور ترویج میں ان کا کردار نمایاں ترین رہا ہے۔ ان کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے بلوچی غزل کو ایک ایسا اسلوب اور لغت عطا کی، جس میں کلاسیکی علامتوں کو جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا، یوں ان علامتوں کو ایک نئی معنویت اور تازگی حاصل ہوئی۔

سید ظہور شاہ ہاشمی کی غزلوں میں رومانویت کا عنصر بھی نمایاں ہے، جس کا اظہار ان کی شاعری میں ایک خوبصورت توازن اور جذبات کی گہرائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہوں نے "ہانل" کے حوالے سے ایک منفرد انداز اپنایا، جو ان کی غزلوں کو مزید دلکش اور اثر انگیز بناتا ہے۔ سید ظہور شاہ ہاشمی کی تخلیقی صلاحیتیں بلوچی غزل کے میدان میں ان کے مقام کو نہ صرف بلند کرتی ہیں بلکہ انہیں ایک ایسا شاعر بناتی ہیں، جس نے بلوچی ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ ان کی شاعری میں قدیم روایات اور جدید رجحانات کا خوبصورت امتزاج بلوچی ادب کے لیے ایک اہم ورثہ ہے۔ سید ظہور شاہ ہاشمی کی قومی شاعری میں قوم دوستی اور وطن پرستی کے گہرے جذبات پائے جاتے ہیں، جو ایک پختہ فکر اور شعور کا مظہر ہیں۔ ان کی شاعری میں قومی اور انقلابی نظریات کا ایسا جوش و خروش ہے جو انقلاب کی سرحدوں کو چھوتا

ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت وحدتِ تاثر ہے، جو ان کے اشعار کو منفرد اور دلکش بناتی ہے۔ خاص طور پر ان کے شعری مجموعے شکلیں شاہجو میں الفاظ کا ایسا تکرار پایا جاتا ہے جو نہ صرف شاعری کو ایک مخصوص اور منفرد انداز دیتا ہے بلکہ ایک خاص قسم کا جمالیاتی پیٹرن بھی عطاء کرتا ہے۔ یہ تکرار شاعری میں روانی اور موسیقیت کا باعث بنتا ہے، جو قارئین اور سامعین کو گہرے اثرات سے دوچار کرتا ہے۔

سید ظہور شاہ ہاشمی کو فارسی، عربی، انگریزی، اور بلوچی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا، جو ان کے علمی اور ادبی قد کاٹھ کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے محض 20 سال کی عمر میں انجمن اصلاح بلوچاں کی بنیاد رکھی اور بلوچی زبان و ادب کی ترویج کے لیے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔

انہوں نے 1950 میں بلوچی شاعری کا آغاز کیا، جس کے ذریعے انہوں نے نہ صرف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا بلکہ بلوچی ادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کی شخصیت ادب، صحافت، اور نشریات کے میدانوں میں انمٹ نقوش چھوڑنے والی ایک مثالی شخصیت کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ 1952 میں سید ظہور شاہ ہاشمی نے بلوچی زبان و ادب کے فروغ کے لیے ایک ادارہ سرچمگ کا آغاز کیا، جو ان کی ادبی خدمات کا ایک اور شاندار پہلو ہے۔ یہ ادارہ بلوچی زبان کی ترویج اور اس کے ادبی ورثے کو محفوظ کرنے کی کوششوں کا اہم مرکز رہا۔ سید ظہور شاہ ہاشمی نے اپنی ساری زندگی بلوچی ادب کی خدمت اور اس کی ترقی کے لیے وقف کر دی۔ بدقسمتی سے، یہ عظیم ادبی شخصیت 14 مارچ 1978 کو وفات پا گئی۔ ان کی وفات سے بلوچی زبان و ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا، لیکن ان کی خدمات اور یادگار تخلیقات انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

بھولنا ممکن نہیں

اپنے در و دیواروں کو بھولنا ممکن نہیں
ہم سفر، ہم نفس یاروں کو بھولنا ممکن نہیں
اک بجلی کی چمک کی دیر ہے اور بس
مچلتے طوفانوں کا بھولنا ممکن نہیں
قدم قدم پر ہر چوک و چوراہے پر

ماضی کی حسین یادگاروں کو بھولنا ممکن نہیں
شادوآباد مرغزاروں کا ذکر ہی کیا
دشت و صحرا، کوہساروں کو بھولنا ممکن نہیں
پرواز میں طائر مریں زبان کا سوکھ کر کانٹا بنے
موت کے سرکش ریگزاروں کو بھولنا ممکن نہیں
دشت و دمن پر برستے بادلوں کا ہجوم
وطن کے حسین نظاروں کو بھولنا ممکن نہیں
ایک ہی وار میں سر تن سے جدا ہو
چمکتی تیز تلواروں کا بھولنا ممکن نہیں

7.5 مراد ساحر:

جدید بلوچی شاعری کا ایک اور اہم نام مراد ساحر 1927ء کو کراچی میں پیدا ہوئے وہ بلوچی غزل کے ایک اہم اور معتبر شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں بلوچی ادب کی روایات کو جدت کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے ملنگ شاہ ہاشمی سے لے کر عصر حاضر تک کے مختلف ذائقوں اور لہجوں کو سمیٹتے ہوئے غزل کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ مراد ساحر نے بلوچی شاعری میں ایک نئی جمالیاتی زبان وضع کی اور اس میں ایک نیا سینٹکس (Syntax) شامل کیا، جس سے نہ صرف احساسات و جذبات کے نئے دریچے وا ہوئے، بلکہ جدید تجربات اور واردات کے نئے امکانات بھی پیدا ہوئے۔

ان کی غزل کے موضوعات کا دائرہ نہ صرف رومانوی بلکہ معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی مسائل کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ مراد ساحر کی شاعری نے غزل کے روایتی پیراہن کو مسترد کرتے ہوئے اسے ایک نئے مفہوم سے آشنا کیا۔ انہوں نے غزل کو جسمانی اور جذباتی موضوعات سے نکال کر اس کا دائرہ وسیع کیا اور اس میں جدت کے ساتھ ساتھ مروجہ موضوعات کی طرف بھی نیا رخ دیا۔ مراد ساحر نے غزل کے ذریعے سماجی حقیقتوں کو بیان کیا اور اسے ایک مضبوط اور جدید بیانیہ عطا کیا۔

مراد ساحر کی تخلیقی شخصیت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے 1956 سے 1998 تک اپنی پوری زندگی میں غزل کو ایک تسلسل کے ساتھ لکھا، اور ان کے فن میں کبھی جمود یا یکسانیت نہیں آئی۔ وہ ہمیشہ نئے خیالات، موضوعات اور اظہاری طریقوں میں ارتقاء کے قائل تھے، جس کے نتیجے میں ان کی شاعری نہ صرف اپنے عہد کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اس میں فکر و فن کے نئے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

ان کی تین اہم شعری مجموعے "پاہار" (1970)، "چیہال" (1987)، اور "زرءِ مروارد" (1995) نے ان کی فنی بصیرت کو مزید اجاگر کیا۔ ان مجموعوں میں انہوں نے عصری مسائل اور سماجی ناانصافیوں کو اپنے فن کا موضوع بنایا، اور ان کے ذریعے اپنی تخلیقی آگہی اور فنی بصیرت کا قائل کرایا۔ 2011ء میں ساحر میموریل سوسائٹی کی جانب سے اُن کا کلیات ہشکن منی پریاتاں شائع ہوا ہے۔

مراد ساحر اپنے عہد کے مسائل اور معاشرتی حالات کا برملا اور سچے انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی اور سیدھی باتوں کی قوت ہے، جو انہیں عوام کے درمیان ایک پسندیدہ شاعر بناتی ہے۔ ان کی غزل میں بلوچستان کی ثقافت، عوامی مسائل، اور محنت کشوں کا دکھ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے غریبوں، مزدوروں، کسانوں، اور محنت کش طبقے کی زندگی کو اپنے اشعار میں نمایاں کیا ہے۔

مراد ساحر کی شاعری میں تبدیلی کی آرزو اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کی ایک واضح کوشش نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار میں ایک نیا اعتماد اور امید کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سیاسی رہنماؤں کی نااہلی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کی منافقت اور جھوٹ کو بے نقاب کیا۔ ان کی شاعری میں مروجہ سسٹم کی تبدیلی اور ایک غیر طبقاتی معاشرے کی تخلیق کا عزم دکھائی دیتا ہے۔

وہ ایک سچے ادیب اور قلم کار تھے جو سماج کی برائیوں اور ناانصافی کے خلاف ہمیشہ ڈٹ کر کھڑے رہے۔ ان کی شاعری میں محنت، جدوجہد، اور اجتماعی یکجہتی کا پیغام ملتا ہے، جو عوامی طاقت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں تیشے، کدال، اور درانتی جیسے اوزار محنت کی علامت ہیں، اور ان کے ذریعے وہ ایک نئے سماجی نظام کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

مراد ساحر کی شاعری بلوچستان کے محنت کشوں، کسانوں، مزدوروں اور پس ماندہ طبقے کے لیے ایک آواز ہے۔ انہوں نے نہ صرف بلوچستان کے مسائل کو شاعری میں پیش کیا بلکہ ان کے درد، مشکلات اور خواہشات کو انتہائی

سادہ اور مؤثر انداز میں بیان کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ عوامی مسائل کو درست انداز میں اجاگر کیا جائے تا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے افسانے بھی لکھے تھے اور ان کا افسانوی مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا مراد ساحر 18 ستمبر 1998ء کو وفات پا گئے۔

مجھے ویراں زندگی کی بات کرنی ہے
سخت جانی و جاں نثاری کی بات کرنی ہے
ہر طرف گرد و غبار ہے، اب تک
مجھے ظلم و زیادتی کی بات کرنی ہے
فضائے دہر پہ تاریکیاں مسلط ہیں
مجھے رنگ و روشنی کی بات کرنی ہے
یہاں ہر روز گردنوں کی فصل کٹتی ہے
مجھے لہو کی ارزانی کی بات کرنی ہے
وہ خواب لے اڑا آنکھوں کا
مجھے دل کی ویرانی کی بات کرنی ہے
جسم جیسے جلتا ہوا دوزخ ہے
مجھے غم کی کہانی کی بات کرنی ہے
مجھے ہر عہدِ جبر میں، ساحر
دوست سے دوستی کی بات کرنی ہے

7.6 عطاشاد:

بلوچی ادب کا وہ معتبر نام ہے جس نے اپنی تخلیقات سے نہ صرف بلوچی زبان و ادب کو نئی شناخت دی بلکہ اسے جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا اصل نام محمد اسحاق تھا، لیکن وہ اپنے قلمی نام عطاشاد سے مشہور ہوئے، جو آج بلوچی ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ 1939 میں بلوچستان کے علاقے

کیچ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تخلیقی اظہار کے ذریعے ادب کی شکل دی۔ وہ 13 فروری 1997 کو اس دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن ان کی تخلیقات آج بھی بلوچی ادب کے لیے ایک مشعلِ راہ ہیں۔ عطاشاد جدید بلوچی نظم اور غزل کے نمایاں شاعر تھے جنہوں نے اپنی نظموں میں نہ صرف فطرت، انسانی جذبات، اور سماجی مسائل کو موضوع بنایا بلکہ ان موضوعات کو جدید فکری زاویوں سے روشناس کرایا۔ ان کے بلوچی شعری مجموعے 'شب سحار'، 'اندیم'، اور 'روچ گر' بلوچی ادب میں بے مثال اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مجموعوں کو ان کی تخلیقی کاوشوں کا عکاس سمجھا جاتا ہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے بلوچی شاعری میں علامت نگاری اور تصویریت کو متعارف کروایا، جو ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

عطاشاد نے بلوچی لوک ادب پر بھی گراں قدر کام کیا اور اس ضمن میں ان کی ایک اہم کتاب "درین" عین سلام کے ساتھ شائع ہوئی، جسے بلوچی لوک ورثے اور روایتی کہانیوں کا ایک معتبر حوالہ مانا جاتا ہے۔ یہ کتاب اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ عطاشاد نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک محقق اور بلوچی ثقافت کے حقیقی سفیر بھی تھے۔ عطاشاد نے بلوچی شاعری میں جدت اور روایت کے حسین امتزاج سے ایک نئی تخلیقی راہ ہموار کی۔ ان کی شاعری میں عوامی جذبات اور تجربات کو نہایت نفاست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں انسانی کرب، سماجی مسائل، محبت، اور فطرت کے رنگ نمایاں ہیں۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے بلوچستان کے عوام کی اجتماعی فکر، شعور، اور امیدوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری نہ صرف ادبی اعتبار سے بلند ہے بلکہ فکری لحاظ سے بھی گہری ہے۔

عطاشاد کی تخلیقی صلاحیتوں کا دائرہ صرف بلوچی زبان تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے اردو میں بھی دو شعری مجموعے 'سنگاب' اور 'برفاگ' تخلیق کیے، جو ان کے فکری کمالات کا مظہر ہیں۔ اردو شاعری میں ان کی تخلیقات محبت، جدوجہد، اور انسانی جذبات کے گہرے احساسات کا آئینہ دار ہیں۔ ان کے اشعار سادہ زبان میں گہرے مفاہیم اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں، جو ان کے منفرد اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں۔

عطاشاد کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اعلیٰ اعزازات سے بھی نوازا گیا، جن میں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی، ستارہ امتیاز، اور ریڈیو ایوارڈ شامل ہیں۔ یہ اعزازات ان کی ادبی خدمات اور بلوچی ادب کی ترقی میں ان کے کردار کا واضح اعتراف ہیں۔ عطاشاد کی شاعری میں فطری مظاہر اور انسانی جذبات کے ساتھ ساتھ جدید فکری رجحانات اور علامت نگاری کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ان کے الفاظ کی تازگی اور خیالات کی گہرائی نے بلوچی

شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ وہ بلوچی نظم میں آزاد نظم کے رجحان کے علمبر دار تھے اور انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے اس صنف کو فکری اور فنی بنیادوں پر مضبوط کیا۔ ان کی تخلیقات روایت اور جدیدیت کا سنگم ہیں، جو نہ صرف قاری کو متاثر کرتی ہیں بلکہ ادب کی نئی جہات کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ ان کی ادبی وراثت بلوچی ادب کا وہ روشن باب ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

دل جلاؤ کہ دل میں روشن رہیں ہزار چراغ
اس تیرہ شبی میں کام نہ آئیں گے دو چار چراغ

شوق وارفتگی، خیالوں کی دھمک، آگہی کا عذاب
چراغ تھے اپنے کہ یہ شب ہے تیرہ و تار چراغ

تیرے عارض کی سحر، ہونٹوں کی مہک، گر ساتھ ہوں اپنے
تو ظلمتِ شب میں ہمیں نہ ہوگا درکار چراغ

آ کہ میں نے تیرے لئے شبِ حیات سے چھین لی ہیں چند گھڑیاں
بس اک شب کا مہمان ہوں، کہ میں ہوں سحر کا خفیف و نزار چراغ

عطا یہی تو ہے اپنا پیامِ حیات، منزلِ مراد
کہ راہِ وفا کو روشنی بخشیں مانندِ مینار چراغ

7.7 اکبر بارکزئی:

اکبر بارکزئی 14 ستمبر 1939ء کو پیدا ہوئے وہ جدید بلوچی شاعری کے اہم شاعر ہیں جنہوں نے شاعری میں نہ صرف داخلی دنیا کی گہرائیوں میں جھانکنے کا رجحان دیا، بلکہ ان کے اشعار میں بیرونی دنیا کی حقیقتوں، عالمی مسائل اور فرد کے اجتماعی جدوجہد کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری ایک حقیقت پسندانہ اور معروضی نقطہ نظر پیش کرتی ہے، جو نہ صرف ان کی ذاتی سوچ کی عکاسی کرتی ہے، بلکہ پورے سماج کے اندر چھپے ہوئے پیچیدہ مسائل کو بھی سامنے لاتی ہے۔ اکبر بارکزئی کی شاعری میں ایک تسلسل ہے جو ان کے ارتقائی سفر کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں انسان اور کائنات کے درمیان ایک گہرا رشتہ نظر آتا ہے، جہاں وہ کائنات کو انسان کے ذاتی تجربات اور احساسات سے جوڑتے ہیں۔ بعد ازاں، ان کی شاعری میں سماجی، سیاسی اور فلسفیانہ مسائل کی طرف رجحان بڑھتا ہے، جو ان کے ادبی

افق کی وسعت اور گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کا فلسفیانہ اور فکری رجحان ہے۔ ان کے اشعار میں کائنات کے راز، انسان کے باطن کی گہری حقیقت، اور سماجی حقیقتوں کی کھوج شامل ہے۔

اکبر بارکزئی کی شاعری میں استعارات کا استعمال بہت عمدگی سے کیا گیا ہے، جہاں وہ قدرتی عناصر کو انسانی جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں پرندوں، درختوں، دریا، پہاڑوں، چاند، سورج اور دیگر قدرتی مظاہر کو انسان کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان استعارات کے ذریعے وہ نہ صرف انسان کی داخلی کشمکش کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قدرت اور انسان کا رشتہ اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اکبر بارکزئی کی شاعری میں "انقلاب" اور "آزادی" کے موضوعات بھی اہم ہیں۔ ان کی نظموں میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ انسان کی عظمت اور وقار اسی میں ہے کہ وہ اپنے حقوق کی آواز بلند کرے، چاہے وہ کسی بھی حالت یا پس منظر میں ہو۔ ان کی نظم "ثور انقلاب" اس بات کی غماز ہے کہ وہ ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے والے ہر فرد کے ساتھ ہیں اور ان کی جدوجہد کو سراہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انفرادی آزادی، اخلاقی خود مختاری اور خود شناسی کی بات کی گئی ہے، جس میں وہ انسان کو اپنے اندر کے تضادات اور کمزوریوں کو پہچاننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ان کی شاعری میں پوری انسانیت کے لئے محبت دکھائی دیتی ہے۔ محبت کا مفہوم کسی ایک شخص یا رشتہ تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک عالمی سطح پر انسانی احساسات کی جھلک ہے۔ ان کی نظمیں انسانی برابری، ہمدردی، اور محبت کے اصولوں کو اجاگر کرتی ہیں، جہاں وہ ظلم و جبر کے خلاف ایک ہمدردانہ اور محبت بھری مزاحمت کو پیش کرتے ہیں۔ ایک اور اہم پہلو اکبر بارکزئی کی شاعری کا "ماضی اور حال کا رشتہ" ہے۔ وہ ماضی کی درخشاں روایات اور موجودہ دور کے مسائل کو ایک ساتھ دیکھتے ہیں اور ان کے درمیان کی خلاء کو پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اکبر بارکزئی کی شاعری میں وہ انسان کو اس کی اصل حقیقت، اس کی روحانیت اور اس کی اعلیٰ مقصد کے لئے متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان کے روحانی ارتقاء کی ضرورت اور اس کی تلاش کو اہمیت دی گئی ہے، جس میں وہ اسے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ روچ ءَ کئے کشت کنت 1988ء میں شائع ہو چکا ہے۔

سورج کو کون قتل کر سکتا ہے

رات تاریکیوں کی سجی بزم تو
چمگادڑوں نے کہا
تاجورِ زندگی کا وہ سورج جو تھا
مر گیا،
ہم نے دفنا دیا
اور ہنستے رہے
رات کے دشت میں کھو کے رہ جائیں گے
چاند تارے زمین آسماں،
کہکشاں
ڈوب جائیں گے سب
تیرگی میں سبھی
ہمتوں اور جذبوں پہ موت آئے گی
ماند پڑ جائیں گے
پیار کے ولولے
مہر و اخلاص سولی پہ گڑ جائیں گے
شہریارِ جہاں روشنی کا خدا
فیبسِ زرفشاں اور آدونیس
جانِ آفرودینی
گر نہ ہوں تو کبھی
لوٹ کر پھر نہ آئے بہارِ وطن
روٹھ جائے سدا کے لیے، شاعری

ساز دم توڑ دیں
مار ڈالے جو سورج کو اور آگہی کو مقید کرے
کوئی ایسا نہیں، جراتوں کا امیں
جب بھی چھانے لگی رات کی تیرگی
مسکراتے ہوئے تابہ دل میں تو ہوتا ہوں گا طلوع
مار ڈالے جو سورج کو
اور آگہی کو مقید کرے
کوئی ایسا نہیں
جراتوں کا امیں
تیغ زن سورما
رات کے دشت میں محو رقصاں رہے
بھولے چرواہڑ مگر
جانتے تک نہ تھے
رات ڈھل جائے گی
مست جلوہ فشاں
دن نکل آئے گا، رات کے باسیو
فیبسِ وقت ہوں، چے گویرا ہوں میں
ضوفشاں زندگی ہوں، امر ہوں کہ میں
جب بھی چھانے لگی رات کی تیرگی
مسکراتے ہوئے تاابد میں تو ہوتا رہوں گا طلوع
مار ڈالے جو سورج کو
اور آگہی کو مقید کرے
کوئی ایسا نہیں

7.8 بشیر بیدار:

بشیر بیدار جدید بلوچی شاعری کے اہم ستون ہیں، جنہوں نے اپنی منفرد شاعری اور گہرے خیالات سے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ 1950 میں پیدا ہونے والے بشیر بیدار نے میٹرک کے دوران شاعری کا آغاز کیا، اور ان کا شعری سفر بلوچی ادب میں ایک نیا رنگ اور انداز لے کر آیا، جس میں انسانی جذبات، سماجی مسائل اور عوامی شعور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا اسلوب سادہ مگر دلکش اور اثر انگیز ہے، جو قارئین کے دلوں کو چھو کر انہیں گہرائی سے سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔

بشیر بیدار کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلو نمایاں ہیں۔ ان کے کلام میں ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ سماجی ناانصافیوں، استحصال اور انسانی حقوق کے مسائل پر بھی مضبوط اور مؤثر انداز میں آواز بلند کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی آزادی، مساوات اور انقلابی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے، جو ان کے کلام کو نہ صرف بلوچی ادب بلکہ عالمی سطح پر بھی منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

بشیر بیدار کے تین اہم شعری مجموعے "گوربام"، "ہزام" اور "کریاب" ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ یہ مجموعے ان کے خیالات کی گہرائی اور فنی مہارت کے عمدہ نمونے ہیں، جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے اشعار انسانی جذبات اور سماجی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ قارئین کے دلوں کو منفرد انداز میں متاثر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موجود موضوعات کی سادگی اور گہرائی کا امتزاج انہیں منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ بشیر بیدار نہ صرف بلوچی ادب کے اہم شاعر ہیں بلکہ ان کی شاعری میں عالمی نظریات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے زندگی کی پیچیدگیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتے ہیں جہاں انصاف، مساوات اور آزادی کا بول بالا ہو۔ بشیر بیدار کی شاعری امید، جدوجہد اور زندگی کی حقیقتوں کا عکس ہے۔ ان کا کلام ایک ایسا پل ہے جو انفرادی اور اجتماعی شعور کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے۔

امان اللہ گچکی نے ان کے شعری مجموعے "کریاب" کے پیش لفظ میں بشیر بیدار کی شاعری کو درد کی شاعری قرار دیا۔ ان کے مطابق، بیدار کی شاعری انسانیت کے قرب کی شاعری ہے، جو زندگی کے دکھ، سماج کے درد، بلوچستان کی محرومیوں اور بے بس انسانوں کے مسائل کی گہرائی کو بیان کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں عوامی حقوق، انسانی جدوجہد اور آزادی کی خواہش کا عکس ملتا ہے۔ بشیر بیدار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں، اور انہی کی

طاقت سے سماجی اور سیاسی رہنما اقتدار حاصل کرتے ہیں۔

وقت کا سقراط در بدر ہے آج
جھوٹ کا فرعون معتبر ہے آج
اندھیروں کے ہاتھ میں اہل بصیرت کی رہنمائی ہے
بے خبر اپنے عہد کا دیدہ ور ہے آج
کیا حال ہے تمہارا، اپنی سناؤ تم
میرے ساتھ جو ہوا تم کو کیا خبر ہے آج
تیرے قد و قامت کی بات کیا چھڑی پیارے
ہر زبان پر میری دیوانگی کی خبر ہے آج
ہمارے ساتھ جو ہوا بشیر ہم جانیں
ہماری محبتوں کی گلستاں بے ثمر ہے آج

7.9 اللہ بشک بزدار:

جدید بلوچی شاعری کی ایک منفرد اور توانا آواز، جو سادگی، انکساری اور اپنے منفرد لب و لہجے کے باعث پہچانی جاتی ہے، اللہ بخش بزدار ہیں۔ ان کا کلام بلوچی ادب میں ایک ایسی تازگی اور گہرائی کا حامل ہے جو قاری کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ اسے غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ ان کا تعلق کوہِ سلیمان کے دامن میں واقع ضلع ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں سے ہے، جہاں 1952 میں وہ پیدا ہوئے۔ اللہ بخش بزدار کی شاعری اپنے اندر ایک فلسفیانہ گہرائی، انقلابی سوچ اور انسانی ہمدردی کا ایسا امتزاج رکھتی ہے جو ان کے کلام کو دیگر معاصر شاعروں سے منفرد بناتا ہے۔ ان کی شاعری میں وطن سے محبت، مظلوموں کے حق میں آواز بلند کرنے کا جذبہ اور معاشرتی مسائل کی عکاسی بڑے دلنشین اور موثر انداز میں کی گئی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "ہشکیں رکھ سبز بنت" بلوچی ادب میں اپنی نوعیت کی ایک شاندار مثال ہے، جس میں بلوچستان کی داخلی و خارجی صورتحال، سماجی ناانصافی اور عوامی جدوجہد کو انتہائی باریکی سے بیان کیا گیا

ہے۔ان کے اشعار میں وطن سے محبت اور اس کی آزادی کا خواب ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں نہ صرف بلوچ عوام کے دکھ درد کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ان کے مسائل کے حل کی راہیں بھی تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں بلوچستان کی محرومیوں اور بدحالی کا ذکر ایک مضبوط بیانیے کے طور پر ابھرتا ہے، جو بیرونی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی کمزوریوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ بزدار کا ایک اور اہم شعری مجموعہ سمیناں گوانک جن اث ڈیھءَ 2024 میں شائع ہوا ہے۔

اللہ بخش بزدار کا اسلوب سادگی اور اثر پذیری کا شاہکار ہے۔ وہ عام فہم زبان میں گہرے خیالات پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں موسیقیت، نغمگی اور ایک فطری روانی موجود ہے، جو سامعین اور قارئین کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ ان کے الفاظ میں ایک خاص جادو ہے جو دلوں کو چھو لیتا ہے اور ذہنوں کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ بلوچی ادب کے اس روشن ستارے نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف بلوچی زبان و ادب کو ترقی کی نئی راہوں سے روشناس کرایا بلکہ اپنی قوم کی جدوجہد، حقوق، اور خوابوں کی ترجمانی بھی کی۔ ان کی شاعری بلوچ عوام کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک مضبوط آواز بن چکی ہے۔ اللہ بخش بزدار کی تخلیقی کاوشیں بلوچی ادب کا ایسا سرمایہ ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی، اور ان کے کلام کا اثر نسلوں تک قائم رہے گا۔

سچ ایک لفظ ہے
لیکن زہر سے بھی تلخ ہے یہ لفظ
برائی اور کج ادائی سے بھی بڑھ کر تلخ ہے یہ لفظ
بے ننگ و ناموسی سے بھی بَرا اور سخت تر ہے یہ لفظ
غربت اور تنگدستی اچھے لفظ ہوں شاید
صبر بھی خوبصورت لفظ ہوتا ہے
مگر سچ بہت ہی بَرا لفظ ہے یارو!
آؤ! اسے وطن بدر کر دیں
کتابوں کو جلا ڈالیں
اسے معصوم بچوں کی نگاہوں سے بچا رکھیں

7.10 مبارک قاضی:

مبارک قاضی بلوچی شاعری کا وہ درخشاں ستارہ ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں، جذباتی گہرائی، اور فکری وسعت کے ذریعے شاعری کو ایک نئی بلندی عطا کی۔ ان کا تعلق بلوچستان کے تاریخی و ادبی مرکز پسنی سے ہے، جہاں وہ 24 دسمبر 1956 کو پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت اور فن دونوں بلوچی ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ قاضی نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں مکمل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی کا رخ کیا۔ اگرچہ مالی مشکلات نے ان کے تعلیمی سفر میں رکاوٹیں پیدا کیں، لیکن 1978 میں کراچی کے آرٹس کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

مبارک قاضی کی شاعری عشق، رومان، سماجی انصاف، اور سیاسی شعور کی عکاس ہے۔ ان کے کلام میں نہ صرف رومانوی جذبات کی گہرائی ہے بلکہ سماج کے مسائل، انقلاب، اور عوامی دکھ درد کو بھی بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں کے ایک کامیاب شاعر تھے اور دونوں اصناف میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کی دلکشی اور فطرت کی خوبصورتی جھلکتی ہے، جب کہ ان کی نظمیں سماجی مسائل اور عوامی جدوجہد کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

مبارک قاضی کی شاعری میں انفرادیت اور جدت نمایاں ہیں۔ انہوں نے بلوچی زبان میں نئی تراکیب اور الفاظ متعارف کروائے اور اپنے کلام میں روایتی انداز کے ساتھ ساتھ جدید فکر اور اظہار کے نئے پہلو شامل کیے۔ ان کی شاعری نہ صرف بلوچی زبان و ادب کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے بلکہ عوامی مقبولیت کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ ان کے اشعار گھروں، محفلوں، اور عام گفتگو میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ عوام میں ان کی پذیرائی کا یہ عالم تھا کہ انہیں "ابا قاضی" کے لقب سے نوازا گیا، جو ان کی مقبولیت اور اثر پذیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے شعری مجموعے، جن میں زر نوشت، شاگ ماہ، سبزیں ساوڑاءِ، قصہ، ہانی منی ماتیں وطن، اور جنگل چنچپ زیبا شامل ہیں، بلوچی ادب کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ ان مجموعوں میں محبت، حسن، سیاست، اور معاشرتی مسائل کے ساتھ بلوچستان کی ثقافتی زندگی اور تاریخی پس منظر کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی سادگی اور گہرائی کا امتزاج پایا جاتا ہے، جو ہر طبقے کے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

مبارک قاضی ایک بے باک اور روشن خیال شاعر تھے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عوامی مسائل کو بلند آواز دی۔ ان کی شاعری میں نہ صرف بلوچی عوام کی ثقافتی شناخت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان کے حقوق اور وسائل کی محرومی کے خلاف جدوجہد بھی نمایاں ہے۔ وہ شاعری کو صرف فن کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک سماجی اور سیاسی

جدوجہد کا آلہ بناتے ہیں۔16 ستمبر 2023 کو مبارک قاضی کی وفات بلوچی ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ ان کی زندگی اور کلام نے بلوچی شاعری کو نہ صرف ایک نئی شناخت دی بلکہ اسے عالمی سطح پر ایک منفرد مقام بھی عطا کیا۔ ان کی غزل اور نظم دونوں اصناف میں تخلیقی مہارت، موضوعاتی وسعت، اور عوامی رابطے نے انہیں ادب کے میدان میں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔

جلتا شہر

ترجمہ:

اپنا بچا کچا متاعِ زندگی لیے
میں خواہشوں کے جلتے شہر کے
بھسم فصیلوں پہ کھڑا ہوں تن تنہا
کہ اس بے اماں زندگی کے نیلام گاہ میں
عہدِ رفتہ کے سبھی نقوش اب قصہ پارینہ ہوئے
آ کہ ذرا میری بربادی کا نظارہ دیکھ لیں
جلتے شہر کی راکھ ہوتی فصیلیں دیکھ لیں
میری یادوں سے وابستہ یہ مرا وہ گھر تھا
جو جل گیا
میرے آنسوؤں کا یہ وہ جوئے خوں ہے
جو رواں دواں ہے ہر طرف
یہ میری سسکتی آہوں کا وہ سائبانِ مہرباں ہے
جو ڈھے گیا
یہ ہے میری امیدوں کا وہ ویران چراغ
جو بجھ گیا
یہ میرے یقین کا وہ سرمایہ تھا
جو اب لُٹ گیا
یہ میری خواہشوں کا وہ شہرِ خاک ہے
جس کے نشان اب مٹ گئے

یہ میری فکر کا وہ گنبدِ بے در ہے
جس میں میری سوچ کا لاشہ دفن ہے
یہ میری تجسس کی وہ قبر ہے
جس میں ماہ و سال کے انمول لمحے قید ہیں
گیت، سنگیت، ساز و سوز اور عہدِ رفتہ کے
حسین یادیں دفن ہیں
وہ دیکھو اک بڑھیا
منتظر آنکھوں لیے بیٹھی ہے انجیر کے سائے تلے
وہ دیکھنا ایک شہوار نظر آتا ہے
نیزے پہ گڑا
وہ دیکھیں اک مہ جبیں
تنہا کھڑی ہے چلچلاتی دھوپ میں
وہ ذرا محبت کے مسجد کا گنبد دیکھ لیں
ذرا ذکرِ دل کا وہ مینارہ دیکھنا
کہ جس کے سائے تلے
ہاتھ میں کشکول و عصا تھامے
کھڑا ہے اک فقیر بے نوا
اب اس راکھ کا ڈھیر ہے
میرا دیار!
آ میری بربادی کا نظارہ دیکھ لیں
جلتے شہر کی راکھ ہوتی فصیلیں دیکھ لیں

خود آزمائی

1. جدید بلوچی شاعری کے ارتقاء کے عوامل اور اس کے بانی شعرا کون سے ہیں؟
2. میر گل خان نصیر اور عطا شاد کی شاعری میں کون سے موضوعات غالب ہیں، اور ان کے اندازِ بیان میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟
3. جدید بلوچی شاعری میں سماجی مسائل اور قومی شعور کو کیسے اجاگر کیا گیا ہے؟
4. بشیر بیدار اور مبارک قاضی کی شاعری بلوچی ادب میں کس طرح کی انفرادیت رکھتی ہے؟
5. بلوچی شاعری کے عصری رجحانات اور ان کے قومی و بین الاقوامی اثرات کو بیان کریں۔

یونٹ نمبر8:

بلوچی افسانوی ادب

تحریر:ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل:ڈاکٹر زیب النساء

فہرست

	یونٹ کا تعارف	141
	مقاصد	141
8۔	بلوچی افسانوی ادب	142
8.1	افسانہ	142
8.2	ناول	149
8.3	ڈرامہ	153
	خود آزمائی	156

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ بلوچی فکشن نگاری پر مرکوز ہے جن میں بلوچی فکشن نگاری کے آغاز و ارتقا، نامور فکشن نگار اور ان کے فن پر بحث شامل ہے۔ اس یونٹ میں بلوچی افسانے، ناول اور ڈرامے کے جائزے کے ساتھ ساتھ بلوچی افسانے کے آغاز و ارتقا معروف افسانہ نگاروں اور ان کے کام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچی ناول نگاری کی روایت، نالوں کے مختلف موضوعات اور بلوچی ڈرامے کا ارتقائی سفر کا احوال بھی شامل ہے۔ یونٹ میں ریڈیو، ٹی وی، اور اسٹیج ڈراموں کی روایت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ!

1۔ بلوچی افسانے کے آغاز و ارتقا کو مختصراً بیان کر سکیں گے۔

2۔ بلوچی ناول نگاری کے آغاز پر گفتگو کر سکیں گے اور اس کے مختلف موضوعات کو بیان کر سکیں گے۔

3۔ بلوچی ڈرامے کے ارتقا میں ریڈیو اور ٹی وی کا کردار بیان کر سکیں گے۔

4۔ بلوچی فکشن نگاری میں معروف فکشن نگاروں کا تذکرہ اور ان کی خدمات کو بیان کر سکیں گے۔

8۔ بلوچی افسانوی ادب

8.1 افسانہ:

افسانہ ادب کی نثری صنف ہے۔ لغت کے اعتبار سے افسانہ چھوٹی کہانی کو کہتے ہیں۔ ناول زندگی کا کُل اور افسانہ زندگی کا ایک جز پیش کرتا ہے۔ جبکہ ناول اور افسانے میں طوالت کا فرق بھی ہے اور وحدت تاثر کا بھی۔ لیکن موجودہ ادبی تناظر میں افسانے سے مقصود مختصر افسانہ ہے جو کم سے کم آدھے گھنٹے میں یا آدھی نشست میں پڑھا جاتا ہے یعنی ایک ایسی ادبی صنف جو خیالات، جذبات اور حالات کو مختصر کہانی کے انداز میں پیش کرے، اس میں کرداروں، واقعات اور مکالمات کے ذریعے ایک مخصوص موضوع یا پیغام کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں اور واقعات کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں اس کی ساخت میں آغاز عروج اور انجام ہوتا ہے۔ افسانہ معاشرتی مسائل انسانی رویے اور زندگی کی پیچیدگیوں کی عکاسی کرتا ہے یعنی ایک ایسا قصہ جس میں کسی ایک واقعہ یا زندگی کے کسی اہم پہلو کو اختصاراً اور دلچسپی سے تحریر کیا جائے اسکالرز کے مطابق "افسانہ ایک ایسی بیانیہ صنف ہے جو اتنی مختصر ہو کہ ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے، جسے قاری کو متاثر کرنے کے لئے لکھا گیا ہو اور جس سے وہ تمام غیر ضروری اجزا نکال دیئے گئے ہوں، جو تاثر قائم رکھنے میں معاون نہ ہوں، اس میں " وحدت تاثر" اور "کلیت" (Totality)ہو"۔ افسانہ کو بلوچی میں ''آزمانک'' کہتے ہیں اور افسانہ نگار کو ''آزمانکار یا آزمانک نویس'' کہتے ہیں۔ بلوچی میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسوی صدی کی پانچویں دہائی میں ہوتا ہے۔ بلوچی افسانہ نگاری دوسری زبانوں کے افسانے سے قدرے مختلف ہے۔ اس کا آغاز واقفیت نگاری سے ہوا پھر مافوق الفطرت اور ماورالعقل موضوعات کا عنصر اس میں داخل ہوا اور بعد ازاں ٹھوس عملی مباحث کی طرف رخ کیا۔ بلوچی افسانہ شروع ہی سے یکساں حقیقت پسندانہ روش کا حامل رہا ہے۔ موجودہ صورت میں افسانے کا آغاز ۱۹۵۰ کی دہائی میں ہوا ہے۔ جسے ماہتاک ''اومان کراچی'' جیسے رسالوں کے اجراء سے تحریک ملی۔ بلوچی کا پہلا افسانہ ''بے وفا'' ہے جو ماسٹر حسن تاج نے لکھا ہے۔ شیر محمد مری کو بلوچی افسانے کا بنیاد گزار مانا جاتا ہے۔ جن کا پہلا افسانہ ''گنوک''(دیوانہ) پہلی بار ماہتاک بلوچی کراچی کے اگست ۱۹۵۶ کے شمارے میں شائع ہوا۔ جو ایک دینی اور قبائلی معاشرے کے پس منظر میں سماجی موضوع پر بیانیہ اور سماجی حقیقت پسند تکینکوں کا افسانہ کہا جاتا ہے۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں دوسرے قابل ذکر افسانہ نگاروں میں مراد ساحر

،نعمت اللہ گچکی، صورت خان مری، طاہر محمد خان، سید ظہور شاہ ہاشمی، محمد بیگ بلوچ، نسیم دشتی، عبد اللہ جان جمالدینی ،عصمت اللہ جمالدینی، محمد اعظم آسکو جمالدینی، عبد القادر نوری، فقیر محمد عنبر، گلزار خان مری، کریم دشتی، عبد الغفار گچکی، عبد الرحمٰن غور، برکت علی اور بعض دیگر شامل ہیں۔ جن میں مراد ساحر کے افسانے ''گرمیں ساھگ ''(گرم سایہ)اور ''گرند''(بجلی کی گرج)۔ عبد القادر نوری کا افسانہ تہاریں شپ ''(اندھیری رات)اورآسکو جمالدینی کا افسانہ ''غریبانی ننگ ءُامیرانی گواچی ''(غریبوں کی عزت اورامیروں کا تحفہ) خاص طور پر مشہور ہے۔ جو زیادہ تر پسماندہ اور دیہی معاشرے کے پس منظر میں محبت اور دوستی، غربت، طبقاتی عدم مساوات، ظلم وزیادتی، فرسودہ رسم ورواج اور اسی نوعیت کے دوسرے موضوعات پر بیانیہ سماجی حقیقت پسند اور رومانی حقیقت پسند تکنیکوں میں لکھے گئے ہیں۔

۱۹۶۰ کی دہائی میں ماہتاک اولس کوئٹہ اور پندرہ روزہ زمانہ کراچی جیسے رسائل نکلے تو ان کے اثرات اور معاونت سے بعض نئے افسانہ نگار نمودار ہوئے اور بعض پہلے سے موجود افسانہ نگاروں نے فنی طور پر نکھار حاصل کرلی جس کی بدولت نعمت اللہ گچکی، صورت خان مری اور نسیم دشتی جیسے لکھاری اچھے افسانہ نگاروں کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ جن کے سب سے خوبصورت افسانوں میں نعمت گچکی کے افسانے ''استالے سِست ''(ایک ستارہ ٹوٹا)''اے زندے ''(یہ زندگی ہے)اور ''زندپہ ہزار جنجال ''(زندگی ہزار مصیبتوں کے ساتھ)اور صورت خان مری کے افسانے ''بندی خانہ ءِ باہوٹ ''(قید خانے کا پناہ گزین)''کپے پُل ''(آدھا پھول)اور پروش ءِ سوب (شکست کی فتح)۔ اور نسیم دشتی کے ''ناکو''(چچا)اور ''سور''(شادی) بھی شامل ہیں۔ جو پسماندہ استحصال زدہ بلوچ معاشرے کے پس منظر میں سماجی، رومانی، جنسی، سیاسی اور انقلابی موضوعات پر بیانیہ میں لکھے گئے ہیں۔ اسی دوران مغربی اور مشرقی زبانوں کے لکھاریوں کے افسانے بلوچی میں ترجمے کی صورت میں شائع ہونے لگے۔ جن میں چیخوف، گورکی، موپساں، سارتر، ماہم ہمنگوے، ولیم سرائن، ای لوکس، یوسف سباعی، اشرف محی الدین، قاضی نذر السلام، کرشن چندر اور بعض دیگر افسانہ نگار شامل تھے۔ جس سے افسانے کے فن ہیئت اور تیکنک کے اعتبار سے بلوچی زبان کے افسانہ نگاروں کے علم اور شعور میں اضافہ ہوا اور بلوچی افسانے کی ترویج میں مزید وسعت آئی۔ ۱۹۷۰ کی دہائی میں بلوچی افسانے کی رفتار نسبتاً تیز ہوگئی اور کئی نئے رسالے شائع ہونے لگے۔ جہنوں نے بلوچی افسانے کی ترقی وترویج میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور کئی نئے افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ جن میں غوث بخش صابر، سلطان نعیم قیصرانی، حکیم بلوچ، عبد المالک بلوچ، عزیز محمد بگٹی، عبد القیوم سربازی، عبد القادر مطاہر، عباس علی زیمی، تاج محمد طائر، منیر احمد بادینی، منیر عیسیٰ، علی ریئسی، بشیر بلوچ، غنی

طارق ، الفت نسیم ، غوث بہار ، فضل خالق ، مبارک علی بلوچ ، غلام فاروق ، بانل دشتیاری ، گوہر ملک ، فاطمہ مینگل ، راشدہ بلوچ ، غنی پرواز اور بعض دیگر شامل ہیں۔ اس دہائی کے افسانوں میں موضوعات اور تکینک کے حوالے سے کافی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے نئے موضوعات اور تجربوں سے بلوچی افسانے کو مزید بہتر بنانا اور نفسیاتی موضوعات اور نفسیاتی حقیقت پسند تکنیک اور علامتی تیکنیکیں شامل ہوئیں۔ خاص طور پر مبارک علی بلوچ نے سماجی، جنسی اور جنسی نفسیات پر لکھا۔ سماجی جنسی اور نفسیاتی حقیقت پسند تیکنیک کا افسانہ ''مبات گنجے کہ دل ءِ رنجے ''(ایسے خزانے پر لعنت ہو جو دل دکھائے) مجموعی طور پر ایک نئی چیز تھی۔ جبکہ غوث بخش صابر کا سیاسی موضوع پر لکھا گیا علامتی افسانہ ''دروگ ءِ درمان ''(درد کی دوا) اہم ہیں۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں بلوچی افسانے کو نئی جہت ملی جو بلوچی افسانے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی دہائی ہے جس میں بلوچی افسانہ شعور کی گہرائیوں کو چھونے لگتا ہے اور خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ نت نئی جہتوں سے آشنا ہوئی سیاسی، نفسیاتی، جنسی موضوعات اور علامتی کرداروں کے استعمال سے جدید جہت سے روشناس ہوا۔ بہت سے نئے افسانہ نگاروں نے جنم لیا۔ جس میں صباد شتیاری، رزاق نادر، حفیظ حسن آبادی، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، لطیف عادل، اسحاق محمود ، عزیز پیشکانی ، عیسیٰ گل ، زینت ثنا، فریدہ انجم، مبارک قاضی ، عبدالطیف عادل، ممتاز یوسف، ناگمان ہمدم، سعید احمد کاشانی، یاسین مجروح، بہرام بلوچ ، راشدہ بلوچ، بشریٰ ملک ، منصور بلوچ ، اے آرداد، طارق غنی، اصغر علی آزگ، یار محمد یار، تاج محمد طاہر، زرین آسکانی، محمد کریم آزاد، رحیم بخش آزاد، باقر علی شاکر اور شبیر ایرانی شامل ہیں۔ ان نئے افسانہ نگاروں نے اس کاروان میں پرانے افسانہ نگاروں کا ساتھ دینے کے علاوہ بلوچی افسانے کو نئے اسلوب کے ساتھ سنوارنے اور اس کے میعار کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ادبی رسالوں و جرائد اور ادبی تنظیموں نے لکھاریوں کو ساز گار ماحول فراہم کیا۔ جن ادبی اداروں نے اشاعتی پروگراموں کے ذریعے لکھاریوں کو متحد کر کے زیادہ اور معیاری ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ان میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، سید ہاشمی اکیڈمی کراچی، سید لبزانکی مجلس عرب امارات، عزت اکیڈمی پنجگور، لبزانکی کارواں تربت، لبزانکی سرچمگ تربت، نصیر کبُدانی بزانکی دیوان خاران ، ملافاضل اکیڈمی تربت و دیگر شامل ہیں۔ اس دہائی میں غوث بہار اور عباس علی زیبی نمایاں نظر آتے ہیں ۔ غوث بہار نے بلوچ قوم کی قومی نفسیات کو موضوع سخن بنایا اور اپنے علامتی افسانے ''مہشر ''(قیامت) کے ساتھ اس میدان میں نظر آئے کیونکہ یہ افسانہ بلوچی افسانے کی دنیا میں سچ مچ ایک محشر سے کم نہ تھا۔ جس کے اب تک برصیغر کی ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح عباس زیبی نے

انسانی نفسیات کو موضوع بنایا۔ وہ جدید افسانے ''ہر جاہ من ءَبرے بر'' (جہاں چاہو مجھے لے جاؤ) کے ساتھ اس میدان میں حاوی نظر آئے۔ اس طرح کے موضوعات بلوچی افسانے کے صنف میں نئے تجربے تھے۔ نئے رجحانات نے نہ صرف افسانہ نگاری کو نئی جہت دی بلکہ نئے لکھاریوں کے لئے نئی راہیں متعین کرنے کا راستہ بھی فراہم کیا۔ اس سفر کے آغاز نے بلوچی افسانہ نگاری کو جلا بخشی جس کا سہرا اس دہائی کے نئے اور پرانے اہل قلم کو جاتا ہے۔ جنہوں نے شب وروز کی محنت، لگن، جرات کے ساتھ خیالات، نظریات، حالات، واقعات اور علامتی تکنیکوں کی آمیزش سے نئے ادبی ماحول کو جنم دیا۔

۱۹۹۰ کی دہائی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کی سطح پر بین الاقوامی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنی، بائیں بازو کے نظریات کے حامل افراد نہایت ہی اثر انداز ہوئے امریکہ عالمی طاقت کے طور پر دنیا کے افق پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے نظریات کے ساتھ پوری دنیا پر اپنی بالادستی کے ذریعے ان کے وسائل کو اپنی دسترس میں رکھنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہو جاتا ہے۔ جس کے اثرات بلوچی ادب پر واضع دکھائی دیتے ہیں۔ بلوچی افسانے کو نئے موضوعات مل جاتے ہیں اور بعض پرانے موضوعات کو نئے رجحانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن میں نئے معاشی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی، نفسیاتی، صنعتی، تعلیمی اور بین الاقوامی موضوعات شامل ہو جاتی ہیں۔ اس حالات نے نئے افسانہ نگاروں کو بھی جنم دیا۔ جن میں اللہ بخش کرار، عطاء اللہ قحطانی، عبد الصبور بلوچ، باقر علی شاکر، اے آر داد، اصغر علی آزگ، اکبر علی، سید محمد عید، بیزن صبا (ڈاکٹر بیزن بلوچ)، یٰسین مجروح، رفیق زاہد، ناگمان ہمدم (ڈاکٹر ناگمان)، یونس حسین، حنیف شریف، غلام نگوری، مقبول انور، غنی پہلوال، محسن بالاچ، نذیر ناصر، اقبال بالی، واحد بزدار، ساجد بزدار، قمر النسا، نذیر ناصر، عبد الصمد امیری، چراگ لاشاری، منظور بسمل، آمنہ، گوہر حسن آبادی، طاہر حکیم، ستار سنی، پیرل شے تگری' ولید گربونی، میجر مجید، سید میار نوری، عابدہ بلوچ، عبد الخالق خالد۔ عبید شاد، اور واحد قیصرانی' اکبر غمشاد و دیگر لاتعداد افسانہ نگار شامل ہیں۔

اس دہائی کے افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر ناگمان، اللہ بخش کرار، یونس حسین، اے آر داد اور حنیف شریف زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن میں ناگمان کا علامتی افسانہ ''دارءِ اسپ'' (لکڑی کا گھوڑا) کا اس دہائی کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس کا مرکزی خیال گزشتہ صدیوں کے ایک خوش آئندہ خواب پر مبنی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کے مغرب کے خاندانی نظام کے موضوع پر تیز شہری اور سماجی حقیقت پسند تکنیکوں کا افسانہ ''کورءِ تیار (دریا کی

گند)اس دہائی کا بہترین افسانہ نظر آتا ہے، جس کے ذریعے مدبر افسانہ نگار نے بڑی خوش اصلوبی کے ساتھ مغربی ممالک کی نام نہاد ترقی کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ جہاں ترقی کے اثرات سے خاندانی نظام کا ڈھانچہ منتشر نظر آتا ہے اور والدین اور بچے ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آتے ہیں۔ جس کے باعث تنہائی کا عفریت نوع انسانی کو ہڑپ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اسی طرح چاغی کے ایٹمی دھماکوں کے بعد تابکاری کے اثرات کی تباہ کاریوں کے پس منظر پر بانک گوہر ملک کا افسانہ "بلوچ ءَ من ءَ دھکادات" (بلوچ نے مجھے دھکادیا) بھی اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں غربت، بھوک ،افلاس زدہ زندگی کی سکسیاں دکھائی دیتی ہیں۔ محمد بیگ بیگل بلوچ کا طنزیہ افسانہ "انعام" بھی ایک قابل ذکر اضافہ ہے ۔جس میں انعام کے خواہش مند ایک شخص کو اپنی بساط کے برخلاف انعام ملتا ہے۔ جس کے باعث وہ خوش ہونے کے بجائے پریشان ہوتا ہے- اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عالمی سطح پر سیاسی تبدیلیوں اور جنگوں نے دنیا بھر میں معاشی ،معاشرتی، سیاسی، ثقافتی، مذہبی، فکری، نفسیاتی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس حالات کے نتیجے میں نئے موضوعات کا نیا سلسلہ شروع ہوا ملک میں بھی دہشت گردی، خانہ جنگی، فوجی آپریشن اور ہلاکتوں کے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ جس سے قوم دوستی، وطن دوستی، سامراج دشمنی، خواتین کے حقوق، بچوں کے حقوق، اغوا، گمشدگیاں، ہلاکتیں، تنہائی ،خوف، عدم تحفظ، دکھ، درد اور ذہنی، فکری اور شعوری کرب سمیت بہت سے نئے موضوعات نے افسانوں میں جگہ بنا لی جس سے نئی رجحانات کا جنم ہوا اور سابقہ جہتوں میں تبدیلیاں اور بہتری پیدا ہوئی۔ ان حالات سے اہل قلم کو جدید راہیں متعین کرنے پر مجبور کیا۔ نئے تحریک کے اثر میں بلوچی افسانہ نگاروں میں حکیم بلوچ، غنی پہوال، منیر مومن، صبیحہ کریم، آصف شفیق، گلاب غالب' شرف شاد، غنی شریف، ساجد حسین، مقبول ناصر، قیوم فنا، رخشندہ تاج ، سمی پرواز، کریمہ محراب، مہلب بلوچ، عندلیب گچکی، زاہدہ رئیسی و دیگر شامل ہیں۔ مذکورہ بالا تخلیق کاروں نے معیاری اور تجرباتی افسانے تخلیق کر کے بلوچی ادب کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ان میں غنی پہوال کے ثقافتی موضوع اور ثقافتی حقیقت پسندی پر مبنی افسانہ "دمبیگ" کو کافی پذیرائی ملی۔ جس میں بلوچی ثقافت کے احیا پر زور دینے کے ساتھ ساتھ خالصتاً بلوچی زبان کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ منیر احمد بادینی کا افسانہ ہزاریں پاسانی شپ "(ہزار ہا پہروں والی رات) اور ڈاکٹر علی دوست بلوچ کا افسانہ "کاپر" (چھاپڑا) اس دہائی کے بہترین افسانے شمار کئے جاتے ہیں جن میں اوّل الذکر تنہائی، خوف اور عدم تحفظ کے موضوع پر وجودی تکنیک میں لکھا گیا اور دوئم سیاسی اور ثقافتی موضوع پر مبنی افسانہ ہے۔ یہ دونوں اپنے مصنفین کے شاہکار تخلیق نظر آتے ہیں۔ پہلا افسانہ ذاتی اور ذہنی کرب کا آئینہ دار

ہے۔ جبکہ دوسرا قومی اور ثقافتی زوال کی عکس کشی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر بلوچی افسانوں مجموعوں کی بات کی جائے تو اس طرح بلوچی زبان کے پہلے افسانوں کا مجموعہ "نوذور غام" عزیز محمد بگٹی کا ہے جو 1981ء میں شائع ہوا۔ اسی دور کے دوسرے افسانہ نگاروں میں منیر عیسٰے کے تین مجموعے "نودی شل 1989ء"، "کپند1990ء" اور "گرگی تل1994ء" شائع ہوئے جبکہ الفت نسیم کا "آجوئی وگژن 1983ء اور غنی طارق کا "جلار 1983ء جبکہ حکیم بلوچ کے افسانوں اور ڈراموں پر مشتمل مجموعہ "آس ءِ چہر2000ء محمد بیگ بلوچ کے بلوچی افسانوں کا انگریزی ترجمہ "The Prize1996ء اور غنی پرواز کے چار افسانوں کے مجموعے "سانکل1992ء"، "بے منزلیں مساپر1995ء"، "مہر پہ بہا گپت نہ بیت"1997ء اور "مرتگیں مردءِ بچیں چم"2001ء منظر عام پر آچکے ہیں۔ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی اور منیر بادینی بلوچی زبان کے نامور ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ غوث بہار کا افسانوی مجموعہ "زرگوات"1988ء صباد شتیاری کے دو افسانوی مجموعے "ہون ہو شام1994ء اور "ترانگانی ہنزہ"2001ء عباس علی زیمی کا "اوبال1991ء"، تاج محمد طاہر کا "واہگ و مرگ2000ء، واحد دہانی کا "سارءُ بے سار1997ء" اور رزاق نادر کا مجموعہ "زامریں زند2001ء کے نام سے شائع ہوئے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں 2001 میں غنی پرواز کی کتاب "مرتگیں مردءِ پچیس چم" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صباد شتیاری کی کتاب "ترانگانی ہنزہ" سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی اور رزاق نادر کی کتاب "زامریں زند" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، 2003 میں ناگمان کی کتاب "دارءِ اسپ" لجنڈ پبلی کیشنز، جیوانی کی جانب سے 2004 غوث بہار کی کتاب "کرکینک" اور حفیظ حسن آبادی کا افسانوی مجموعہ "ٹپی ایں گوربام" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 2006 میں شائع ہوئے۔ صباد شتیاری کی کتاب "آس ءَ آسیب" سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی کی جانب سے، 2007 میں علی جان قومی کی کتاب "زردءَ پاہار" رژن لبزانکی مجلس، نذر آباد کیچ، مقبول انور کی کتاب "ماہکان ءَ جلشک" گام پبلی کیشنز گوادر، عباس علی زیمی کی کتاب "عباس علی زیمی اکیڈمی، کراچی اور مراد ساحر کی کتاب "گر میں ساہگ" گام پبلی کیشنز گوادر کی جانب سے، 2008، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کی کتاب "مہرءَ تیاب" سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، عصا بجار کی کتاب "موسمے کسانی تہا" نگور لبزانکی مجلس، بل نگور، علی رئیسی کی کتاب "درانڈیہہ" اور غلام نگوری کی کتاب "اِشنکدیں واہگ 2008ء، "بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، حنیف شریف کی کتاب "شپءَ کہ ہور گواریت" اور غنی پرواز کی

کتاب "بندیں چم کہ پچ بنت "بلوچستان اکیڈمی تربت، ناز بلوچ کی کتاب "رستر "قلمکار پبلی کیشنز، کراچی اور عارف وفا کی کتاب "آتار پبلی کیشنز" کراچی، 2009 نورل بلوچ کی کتاب "تنءَ ہوشام "نوک آباد پبلی کیشنز، اے آر داد کی کتاب "درگے پچ بیت "بلوچستان اکیڈمی، تربت، ڈاکٹر علی دوست بلوچ کی کتاب "کاپر "قلات پبلی کیشنز، کوئٹہ، حکیم بلوچ کی کتاب "شہیدے شبینی بچکند، بلوچیہ لبزانکی پبلی کیشنز، کوئٹہ، حنیف ہمراز کی کتاب "بانیءَ ترمپے ارس" قاسم لبزانکی مجلس، مند، آدم علی کی کتاب "وپاءَ ہنزہ"، 2010، منیر احمد بادینی کی کتابیں "ہزاریں پاسانی شپ "نیو کالج پبلی کیشنز کوئٹہ، غنی پرواز کی کتاب "سرشپ مرک "بلوچستان اکیڈمی تربت اور نثار احمد کی کتاب "بے زبانیں کشک "آتار پبلی کیشنز، کراچی کی جانب سے شائع ہوئیں۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہ سفر مزید تیزی اختیار کرلیتا ہے اور اسی طرح 2011 میں نعمت اللہ گچکی کی کتاب "شکل وزہر آپ "بلوچستان اکیڈمی، تربت، ناز بلوچ کی کتاب "جاتیگ" کلمکار پبلی کیشنز، کراچی اور نذر دوست کی کتاب "روچ گوارچ" فکشن پبلی کیشنز، کراچی 2012 اور رخشندہ تاج کی کتاب "کندیل ابدمانت" بلوچستان اکیڈمی، تربت 2012ء، عزیز بگٹی کی کتاب "ترانانی کشار "بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، 2012ء، غنی پرواز کی کتاب "دل مہر مسافر منزل "جمشید پبلی کیشنز، تربت اور محمد سعید قاضی کی کتاب "چے جبر" آتار پبلی کیشنز، کراچی، نذر دوست کی کتاب "کوہِ توارءَانت "سچکان پبلی کیشنز، کراچی اور ابراہیم عابد امیر کی کتاب "سالونکی ارمان "نقش پبلی کیشنز، کراچی 2014 میں عندلیب گچکی کی کتاب "آزاتیءَ روکیں چراگ "سچکان پبلی کیشنز، گوارد، اے آرداد کی کتاب " دریادیماپیداک نت" استین شنکار، کیچ، غلام نگوری کی کتاب "ناسر جمیں کسہ" رئیسی چاپ وشنگ کراچی، ملا مراد کی کتاب "C11" سساشنکار، پنجگور، نثار احمد کی کتاب "جون "کوہ ڈگار لبزانکی مجلس، دشت مکسر، عندلیب گچکی کی کتاب "رژنءَادمان" سچکان پبلی کیشنز، کراچی 2015 میں علی دوست کی کتاب "منی ساہگ آدینکے "استین شنکار کیچ، اسلم تگرانی کی کتاب "کوہ چراگ انت "ریگزار لبزنکی مجلس، گوادر اور منیر بادینی کی کتاب "کلشنگ "نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ 2016 میں شائع ہوتیں۔ اسی طرح احمد ابدال کی کتاب "چمانی پژگاءَ پشکپتگیں واب "کوہ ڈگار لبزانکی مجلس، دشت مکسر، زاہدہ رئیسی کی کتاب "بے کسہءَ من ءَوان نئسیت "رئیسی چاپ و شنگ، کراچی، اصغر زہیر کی کتاب "ہورءَ بر پیں ترمپ "استین شنگار کیچ سے 2016 میں شائع ہوئیں۔

بلوچی افسانہ 70 سال سے زائد عرصے سے جدید بنیاد کے سفر کے بعد رفتار، مقدار اور معیار کی ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک پر امید صورت حال کا نظارہ پیش کرتا رہا ہے۔ واضع رہے کہ مندرجہ بالا سطور

میں چند افسانے کے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔ تاہم افسانوں کی اکثریت شاہکار ہی نظر آتی ہیں۔ ان میں چند بین الاقوامی معیار کی صف میں کھڑی ہیں۔ غنی پرواز کو بلوچی ادب میں تعداد کے اعتبار سے نہ صرف زیادہ افسانے لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ بلکہ انہوں نے اس صنف ادب میں نت نئے تجربات کرنے کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔

8.2 ناول:

نثری ادبی صنف ناول لاطینی زبان کے لفظ ناولا (Novellus) سے ہے۔ جس کا مطلب ہے "نیا" بعد میں یہ لفظ اطالوی Novella کی صورت میں آیا جس کا مطلب تھا نئی چھوٹی کہانی، وقت کے ساتھ ساتھ یہ تبدیل ہوتا ہوا Novel کہلایا جو بڑی یا طویل کہانی کے لیے مخصوص ہوا۔ اردو میں یہ لفظ انگریزی زبان سے آیا ہے اور اس کا مفہوم بھی اسی طرح طویل نثری کہانی کے طور پر اختیار کیا گیا ہے اور ناول کو "نیا" اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ قدیم اصناف جیسے کہ داستان اور حکایت کے مقابلے میں ایک نئی اور منفرد صنف کے طور پر سامنے آیا اور اس نے روایتی کہانی کے انداز کو بتدیل کرتے ہوئے حقیقی زندگی کی عکاسی پر زور دیا جس میں فرد، معاشرہ اور ان کے مسائل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اس لیے اسے ایک جدید اور نئی طرز کی کہانی کے طور پر ناول کا نام دیا گیا ہے۔

ناول کے عناصرِ ترکیبی میں کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، زماں و مکاں، اسلوب، نکتہ نظر اور موضوع وغیرہ شامل ہیں۔ نثری اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں اجتماعی زندگی کے حقائق کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے اور یہ حقائق کی جزئیات کا مشاہدہ بھی پیش کرتا ہے۔

ناول کو بلوچی زبان میں "گدار" کہتے ہیں، ناولٹ کو "گدارُک" اور ناول نگار کو "گدار نویس" کہتے ہیں۔ بلوچی زبان میں ناول نگاری کے بانی نامور ادیب، محقق، نقاد، شاعر سید ظہور شاہ ہاشمی ہیں۔ جن کا واحد تخلیق شدہ ناول "نازک" ۱۹۷۶ میں شائع ہوا۔ یہ ناول گوادر شہر، ساحل اور سمندر کے پس منظر میں روزگار کی مشکلات کے موضوع پر 'سماجی حقیقت پسندی پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا جسے غوث بخش صابر نے ترجمہ کیا تھا۔ بلوچی کا دوسرا ناول ۱۹۸۵ میں بلوچستان کے افغان حصے کے ادیب عبدالستار پردلی کا "سوب" (فتح ہے) جو افغانستان میں غربت، جہالت، مظلومیت اور استحصال کے موضوعات پر مبنی سیاسی، سماجی اور انقلابی پس منظر میں لکھا گیا جس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کیا۔ فقیر محمد عنبر کا ناول "نل ءِ توار" (بانسری کی آواز) تیسرا ناول ہے جو کہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے ۱۹۸۷ میں پہلی بار اور ۲۰۰۱ میں دوسری بار شائع ہوا۔ یہ ناول دیہی اور پہاڑی زندگی

کے پس منظر میں محبت کے عنوان پر رومانوی کہانی ہے جو حقیقت پسند تکنیک میں لکھا گیا۔ چوتھا ناول "جہد کاروان" (انقلابی قافلہ) تھا جسے محمد رضا نے لکھا اور ۱۹۸۹ میں شائع ہوا جو پہاڑی اور دیہی معاشرے کے موضوع پر مبنی سیاسی اور انقلابی ناول ہے۔ پانچواں اور چھٹا ناول منیر احمد بادینی کے ناول "ریکانی تل ءِ ہلکے" (ریگستان میں ایک گاؤں) اور "بلے کہ ماہ بکپیت" (چاند کو ڈھل جانے دو) ہیں اوّل الذکر دیہی اور صحرائی معاشرے میں قحط سالی کے عنوان پر سماجی تخلیق ہے۔ جبکہ دوئم پشین کے پس منظر میں دہشت گردی اور حکومت کے کردار پر فلسفانہ کاوش ہے۔ یہ دونوں کتب بالترتیب ۱۹۹۳ اور ۱۹۹۷ میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ ساتواں ناول نامور استاد و ادیب غنی پرواز کا "مہرءِ ہوشام" (محبت کی پیاس) ہے جو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے ۲۰۰۰ میں شائع ہوا۔ یہ ناول گوادر کے ساحلی شہر کے پس منظر میں محبت اور حقوق کے موضوعات پر سفری، رومانوی اور فلسفیانہ کاوش ہے۔

کوہ سلیمان کی وادی سے تعلق رکھنے والے حاجی خدا بخش بزدار کی "چھیدغ" (مورچہ) بلوچی زبان کا آٹھواں ناول ہے جو کہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے ۲۰۰۱ میں شائع ہوا۔ یہ ناول بلوچوں کی قدیم ریاست چانڈکو کے پس منظر میں قوم دوستی، وطن دوستی اور مزاحمتی جدوجہد کے موضوعات پر تاریخی تخلیق ہے۔ بلوچی کا نواں ناول ڈاکٹر فضل خالق کا "ہر ساعت ءِ چکاس" (ہر لمحہ آزمائش) ہے جو محبت، سمگلنگ اور بچوں کے اغوا جیسے موضوعات پر رومانوی حقیقت اور سماجیات پر مبنی شاہکار ہے۔ اسی طرح دسواں ناول غنی پرواز کا "شپ جتیں راھی" (شب زدہ مسافر) ہے جو سال ۲۰۰۷ میں شائع ہوا۔ یہ ناول آواران کے پس منظر میں محبت، انسانی جیون کے مقصد و معانی پر مبنی رومانوی و تعلیمی تخلیق ہے۔ اسلم دوستین کا ناول "سوتکال" بلوچی کا گیارہواں ناول ہے اور ۲۰۰۸ میں شائع ہوا۔ جو پسنی اور اس کے گردونواح کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق، وطن دوستی اور انسان دوستی کی بنیاد پر رومانوی، تاریخی اور سماجی کاوش ہے۔ منیر احمد بادینی کا ناول ٹرائلوجی "شال ءِ گلیں بازار (شال کے خوبصورت بازار) ہے۔ اس ٹرائلوجی کا پہلا ناول "بلان انت سکہ لالانی" (روشن ہے دیا اپنوں کا) ہے دوسرا "جوزیں جاورانی زورا کی (ظالم صورت حال کی ظلمتیں) اور تیسرا "نازبو آنی ہزار بو" (نازبو کے ہزاروں خوشبو) جو کہ بالترتیب بلوچی کے بارہواں، تیرہواں اور چودھواں ناول ہیں۔ ۲۰۰۸ اور ۲۰۰۹ میں شائع ہوئے۔ نذیر ناصر کا ناول "اگر بیچ" بلوچی کا پندرہواں ناول ہے جو ناصر آباد تربت، ملتان، کراچی اور سلطنت عمان کے پس منظر میں بے وفائی کے عنوان سے خود نوشت سوانح عمری ہے۔ جو ۲۰۰۹ میں شائع ہوا۔ اسی طرح بلوچی کا سترواں ناول حنیف شریف کا "چگر دءَ پھل" (ببول کا پھول) ہے جو بلوچستان اور مسقط، عمان میں بلوچوں

کے معاشرے کے کو مد نظر رکھتے ہوئے سماجی، سیاسی اور انقلابی تخلیق ہے۔ جو ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ظاہر دیدار کا ناول بانی 2010ء، اسلم نگرانی کا ناول قبر آماچیں گدان 2011، غنی پرواز کا ناول مبرءَ ہمراہی، اسلم نگرانی کا ایک اور ناول گمان 2013، مولا بخش بہار کا ناول "ترانگانی در" اور ظاہر دیدار کا ناول ببیل 2014، عارف وفا کا ناول "بلیس بچ" 2014، علی کنعہ زامرنی کا ناول "بے راہیں منزل" 2015 میں بہار گاہ چاپءَشنگ، حب، نثار احمد کا ناول "تن" 2015 میں شنگار زبان، غنی پرواز کا ناول "آس الوت کنان انت، 2016 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ 2016 میں کوہ ڈگار لبزانکی مجلس، دشت مکسر، نذر دوست کا ناول مات ہورءَ سرانت 2016 میں استین شنگار، کیچ حیات شوکت کا ناول بہرام ءَنازی اور شے برکت کا ناول ماہکان 2016 اور 2017 میں بلوچ اکیڈمی کوئٹہ، جاوید ارمان کا ناول زندمانءَزندان 2017 میں عزت اکیڈمی پنجگور، غنی پرواز کا ناول ماہءَسرءُروچءِچیر 2017 میں بلوچستان اکیڈمی، تربت، غنی پرواز کا ناول ماہءَسرءَوچءَچیر 2017 میں بلوچستان اکیڈمی اے، آرداد کا ناول ساہگ واثر کنت 2017 میں استین شنکار کیچ، فقیر محمد عنبر کا ناول آروچ 2018 میں عزت اکیڈمی، پنجگور، زاہدہ رئیسی راجی کا ناول پادءَچیرءَزمین، 2018 اور نوکہ زندے دورے 2019ء، فقیر محمد عنبر کا ناول چاگرد 2018 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع ہوئے اسی طرح زاہدہ رئیسی راجی کی کتاب توکہ زندئے درورے 2019 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے انسٹیٹوٹ آف بلوچیا کی جانب سے اور عمر عثمان کی کتاب تا کچنڈر تگیں ارس 2022، شہید جلیل سنجرانی فاؤنڈیشن پنجگور کی جانب سے مجاہد بلوچ کی ناولٹ ارواحءَچیہانٹ شائع ہوئے۔

منیر احمد بادینی وہ فکشن رائٹر ہیں جو اپنی کہانیوں میں انسان کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی تخلیق کو فلسفہ کے زور سے نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان کے شاہکاروں میں زبان، پلاٹ اور کردار سازی کے اعلیٰ و انمول نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ناول مقصدی اور تفریحی بھی ہیں۔ مقصدی ناولوں میں مابعد الطبیعاتی مسائل رومانوی مزاج اور معاشرتی مسائل کو اہمیت دی گئی ہے۔ ان ناولوں کے کردار حقیقی زندگی کو شامل کرتے اور واقعات اور حادثات پر عمل اور رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ان ناولوں کی فہرست بہت طویل ہے درج ذیل میں صرف ان کے چند ناولوں کی فہرست دی جارہی ہے۔

1۔ اسپیتن اسپءِ سنج بکن، ناول، بلوچی، 2010

2۔ من مراں کہ توبمر، 2011

3۔ جمبڑی ءِ رو کپت، 2012

4۔ چلتن ءِ ساھگ دراج انت بیلاں، 2011

5۔ دل آرام ءِ ڈکھ (اولی بہر)، 2011

6۔ حون ءِ گوانک، 2012

7۔ منی اے زند تئ اوستا، 2012

8۔ بہشت ءِ دوزہ، 2013

9۔ سر بالگ ءِ سر شیوگ، 2013

10۔ مہر ءِ پجار، 2015

11۔ شاہ نویس ءِ یک روچے، 2018

12۔ نوری گوں شاعر ءَ گپتار کنت، 2018

13۔ مُرگ وپال، 2018

منیر بادینی سو سے زائد ناولوں کے ساتھ بلوچی ناول کی صنف اول کے چمکتے ستارے شمار ہوتے ہیں، جبکہ اس کے بعد غنی پرواز، فقیر محمد عنبر اپنے ناولوں کے ساتھ دوسرے اور تیسرے نمبر پر بلوچی کے اہم ناول نگار شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدا بخش بزدار، حنیف شریف، ڈاکٹر فضل خالق، رے آر داد، حیات شوکت، علی جمہ زامرانی، مولا بخش بہار، زاہدہ رئیسی راجی، نذر دوست، محمد رضا، اسلم دوستین، طاہر دیدار وغیرہ نے بلوچی زبان میں ناول نگاری میں بھرپور طریقے سے اپنا حصہ ڈالا ہے۔

اسی طرح دیگر زبانوں کے مشہور ناول ترجمہ کے ذریعے بلوچی ادب کا حصہ بنے۔ ان میں 1976 میں غوث "بخش صابر نے "Ernest Hemingway" کے ناول "The old man and the sea" کو "پیر مرد ءُزر" کے نام سے بلوچی میں ڈھالا جو کہ نوکین دور کے صفحات کا زینت بنا۔ اسی ناول کو برکھا بلوچ نے "پیر مرد ءَساوڑ" کے نام سے شائع کیا۔ یوں یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے اور چالیس کے لگ بھگ دیگر زبانوں کے ناول بلوچی زبان میں ترجمے کیے گئے ہیں۔

8.3 ڈرامہ:

ڈرامہ ایک ادبی اور تفریحی صنف ہے جو عربی زبان کے لفظ "تماشا" اور یونانی لفظ "ڈراما" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے عمل یا کچھ کرنا۔ یہ صنف حقیقت کی عکاسی کرتے ہوئے کرداروں، مقالات اور مناظر کے ذریعے کہانی کو پیش کرتی ہے اور مختلف سماجی، جذباتی اور ثقافتی موضوعات کو سامعین کے سامنے اجاگر کرتی ہے۔ ڈرامہ نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہوتا ہے بلکہ انسانی تجربات، مسائل اور معاشرتی اقدار کو بھی بیان کرتا ہے۔ ڈرامہ بنیادی طور پر تھیٹر، ٹیلی ویژن اور فلم کے لیے لکھا جاتا ہے، جہاں اسے اداکاروں کی مدد سے سامعین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرامہ کی صنف میں کرداروں کے درمیان مکالمے، جذباتی تنازعات اور واقعات کا تسلسل شامل ہوتا ہے جو کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔ ڈرامہ مختلف موضعات پر مبنی ہو سکتا ہے جیسے رومانوی، مزاحیہ، المیہ، سیاسی، سماجی اور تاریخی۔ جب انسان معاشرے میں رہتا ہے تو وہ مختلف طریقوں سے دوسروں کے تاثرات کو بھی محسوس کرتا ہے۔ اور پھر دوسروں کے سامنے ان تاثرات کو پیش بھی کرتا ہے۔ اور جب وہ اس طرح دوسروں کی نقالی کرتا ہے تو ڈرامہ یا ناٹک وجود میں آتا ہے۔ گویا ڈرامہ یا ناٹک انسان کے جذبہ نقالی کا اظہار ہے۔ ارسطو انسان کو سماجی حیوان ہونے کے ساتھ ساتھ نقالی حیوان بھی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نقالی انسان میں بچپن سے ودیعت کی جاتی ہے اور فطرتاً انسان نقالی سے خوشی محسوس کرتا ہے۔

اسکالرز کے مطابق "ڈرامہ دنیا کی پیدائش کے وقت سے شروع ہوا۔ وحشی اقوام کا جنگلوں اور پہاڑوں میں آگ روشن کر کے اپنی بول چال میں آوازیں نکالنا، ناچنا، گانا اور کھیلنا کودنا ناٹک یا ڈرامہ ہی تو تھا۔ ڈرامے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اور مصر اور چین کے ساتھ ساتھ مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان کو اس کی جنم بھومی تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں ڈراما ابتدائی طور پر کھیلا گیا۔ اسے زندگی کی عملی تصویر کہا گیا ہے اور اسے ادب کی اصناف میں قدامت کا افتخار بھی حاصل ہے۔ "ڈرامہ شروع سے بلوچ دیہی ثقافتی سرگرمی کا حصہ رہا ہے۔ دیہات میں تقریباً ہر رات ڈرامہ ہوتا تھا۔ ہمارے ڈرامے خاموش بھی ہوتے تھے اور صوتی بھی کردار انسانی بھی ہوتے تھے اور جانوروں کے بھی۔ مافوق الفطرت مخلوق بھی ہمارے ڈرامے کا حصہ رہی ہے۔ ہماری پوری کلاسیکل شاعری مکالماتی صورت میں ہے۔

بلوچی زبان کا پہلا اسٹیج ڈرامہ "شہناز" ساٹھ کی دہائی میں مراد آوارانی نے لکھا اور یہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ میں مستونگ کے ایک ثقافتی جشن میں پیش کیا گیا اس سے قبل ۱۹۵۴ میں جب ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بلوچی کے

پروگراموں کا آغاز ہوا تو بلوچی میں ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنے کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اور بہت سے ڈرامہ نگار سامنے آئے۔ اسی طرح ۱۹۷۴ میں کوئٹہ سے ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ہوا تو بلوچی کے ڈرامے پیش ہونا شروع ہوئے۔ محدود دائرے کے باوجود بلوچی ڈرامے نے اس دوران خوب ترقی کی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اس کی خوب آبیاری کا ذریعہ بنے۔

بلوچی زبان کے ابتدائی ڈرامہ نگاروں میں عبدالحکیم بلوچ، مراد آوارانی، بشیر احمد بلوچ، عطاشاد، نصیر شاہین، صورت خان مری، احسان اللہ گچکی، ایوب بلوچ، میر عاقل خان مینگل، منیر احمد بادینی، غوث بخش صابر، محمد بیگ بلوچ، سرفراز سلیم بلوچ کے نام آتے ہیں اور بعد ازاں ان ناموں میں رزاق نادر، ڈاکٹر فضل خالق بلوچ، عبدالخالق بلوچ، یوسف عزیز گچکی، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، اے ڈی بلوچ، حفیظ حسن آبادی، حلیم مینگل و دیگر شامل ہیں۔ قدیم عشقیہ داستانوں کو بھی ڈرامائی شکیل دی گئی جن میں شئے داد و مہناز، حمل و ماہ گنج، بیبرگ و گراناز، حانی و شئے مرید، مست توکلی، سمو بیلی اور چاکر و گہرام جیسی تاریخی کہانیاں شامل ہیں۔ مذکورہ قدیم کہانیوں میں ڈرامائی عنصر پہلے سے ہی موجود تھا جب ان کو حقیقی ڈرامے کا روپ دیا گیا تو عوامی پذیرائی اور مقبولیت انتہا کو چھونے لگے۔ ہماری نئی نسل نے محدود وسائل، نامسائد حالات اور سہولیات کی عدم دستیابی کے باوجود اپنی زبان سے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اسٹیج ڈرامے، تھیٹر، مختصر دورانئے کے فلم بنا کر اس صنف کو دوام بخشنے کی کوشش ہے، اس کوشش میں طارق مراد، عمران ثاقب، ثنا بلوچ، جان البلوچی، جلیل پکیر، کمالان بیبرگ بلوچ، شاہنواز بلوچ، سرفراز بلوچ، جمال جہانگیر، ع۔ر۔ گمنام، شاکر شاد، انور عیسیٰ، خیر جان خیرل، عمر کیا، داد بلوچ، امجد بلیدی، سعید بلوچ، علی نواز، علی رند، انور غلام، نصیر جدگال بلوچ، انور حسین۔ اے۔ڈی۔ بلوچ، احسان شاہ، ذاکر داد، شاہ ابن شین، جمعت بلوچ، سراج بلوچ، وقار بلوچ، دانش بلوچ، ولی رئیس وغیرہ، قابل ذکر ہیں۔

اسٹیج ڈرامے، تھیٹر، فیچر فلم اور مختصر دورانئے فلم بنانے کے لئے باقاعدہ تربیتی ادارے نہ ہونے کے باوجود گوادر، تربت، پسنی، کوئٹہ اور کراچی کے نوجوان اپنے سیاسی سماجی، اخلاقی، ثقافتی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہیں، ان تھیٹر، مختصر دورانئے کے فلموں، ڈراموں کے نام "بیااومُرید"، "دوچاپی"، "توکئے"، "لیاری جھٹ پٹ"، "وش دل"، "گنوک ءِ آدینک"، "نوکیں زند"، "نامحرم"، "She"، "آزمان" "جن مرید"، "Man without shadow"، "شوم"، "دین اواسلام"، "استاد کہ عربی کنت"، "جن ءِ لوگ"، "پرچے من سوال

کنان"،" سازگیر"،" ہچ گوشگی نئیں"،"نادراہ"،"گڑ گڑ"،"قندیل"،"من تامر جوڑ کنگ لوٹاں"،"دست بہ دست"،"دیوال" وغیرہ شامل ہیں۔

بلوچی ڈراموں میں نصیر شاہین کی کتاب ڈرامہ 2014ء میں اثیر عبدالقادر شاہوانی کی کتاب گچین کسمانک 1993، غوث بخش صابر کی نگرہ درنز1996، عبدالخالق بلوچ کی دو کتب مہرءَ آشوب اور انجیرءَ پل 1996، غوث بخش صابر کی گوہرءَ درپش 1997 میں اختر ندنم کی ہوشام 1997، ڈاکٹر فضل خالق کی میڈیا2000 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ اسی طرح ڈاکٹر علی دوست بلوچ کے ڈراموں کا مجموعہ بُر تاب 2004 میں نوائے وطن پبلی کیشنز، کوئٹہ، منیر احمد بادینی کی کتاب انشپی سروزنالنت 2010 میں نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ اور عندلیب گچکی کی کتاب ہونانی ہارءَ دیما2013 میں بلوچ رائٹس کونسل، کراچی اور ہیبتان عمر کی کتاب کسمانءَ بلوچی پر، بلوچی اکیڈمی کی جانب سے2019 میں شائع ہوئیں۔

خود آزمائی

1. بلوچی افسانے کا ارتقائی احوال قلمبند کریں۔
2. بلوچی ڈرامے کی روایت پر مختصر نوٹ لکھیں۔
3. آپ کی رائے میں بلوچی افسانوی ادب کے فروغ میں کن عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے؟
4. بلوچی ناول کی روایت پر مختصر اَنوٹ لکھیے۔
5. کوئی سے پانچ ناول نگاروں کے نام لکھیے۔

یونٹ نمبر9:

بلوچستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز

تحریر: ڈاکٹر واحد بخش بزدار
نظر ثانی: ڈاکٹر ضیاالرحمٰن بلوچ
فاصلاتی تشکیل: ڈاکٹر زیب النساء

فہرست

	یونٹ تعارف	159
	مقاصد	159
9	بلوچستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز	160
9.1	مہر گڑھ	160
9.2	ژوب اور لورالائی کے تہذیبی آثار	161
9.3	درہ بولان	162
9.4	میری قلات	163
9.5	شہر روغان	163
9.6	ہربوئی	165
9.7	پیر غائب آبشار	165
9.8	گوادر	167
9.9	ہنہ جھیل	167
9.10	ہنگول نیشنل پارک	168
9.11	ہزار گنجی- چلتن نیشنل پارک	169
	خود آزمائی	169
	حوالہ جات	170

یونٹ کا تعارف

بلوچستان پاکستان کا ایک تاریخی، ثقافتی، اور تہذیبی لحاظ سے انتہائی اہم خطہ ہے، جس کی تاریخ قدیم ترین انسانی آبادیوں اور تمدنی سرگرمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس یونٹ میں بلوچستان کے کچھ اہم تاریخی مراکز اور ثقافتی آثار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جیسے کہ مہرگڑھ کی قدیم بستی، ژوب اور لورالائی کے تہذیبی مراکز، درہِ بولان، گوادر، ھنگول نیشنل پارک، قلات کے تاریخی مراکز، اور شئے روغان۔ ان کے علاوہ ہربوئی، پیر غیب اور دیگر مشہور مقامات بھی اس یونٹ کا حصہ ہیں۔ ان مقامات کے تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں کے مطالعہ سے نہ صرف آپ بلوچستان کی ثقافت اور تاریخ کو سمجھ سکیں گے بلکہ اس کی اہمیت اور انفرادیت سے بھی آشنا ہوں گے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد طلبہ:

1. بلوچستان کے اہم تاریخی مقامات اور تہذیبی آثار کو پہچان سکیں گے۔
2. مہرگڑھ، ژوب، لورالائی اور دیگر مقامات کی تاریخی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔
3. بلوچستان کے ثقافتی ورثے اور اس کی تہذیبی اہمیت کو بہتر طور پر جان سکیں گے۔
4. مختلف تاریخی مراکز اور ان کی تاریخ پر معلومات حاصل کریں گے۔
5. بلوچستان کی تاریخی و ثقافتی میراث کے تحفظ اور فروغ کی ضرورت کو سمجھ سکیں گے۔

9۔ بلوچستان کے تاریخی آثار اور تہذیبی مراکز

9.1 مہر گڑھ:

مہر گڑھ تہذیب جنوبی ایشیا کی قدیم ترین تہذیب سمجھا جاتا ہے اور اس کا شمار دُنیا کے اولین تہذیبوں میں سے ہوتا ہے۔ مہر گڑھ بولان کے دامن میں کچھی، بولان کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔ یہ مقام سبی سے تقریباً26 کلومیٹر جبکہ ڈھاڈر سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔(بلوچ 54:2012) یہ قدیم تہذیبی اور آثاراتی علاقہ لگ بھگ 3 سو ہیکٹر پر محیط ہے۔ مہر گڑھ کی انسانی آباد کاری اور قدیم تہذیبی آثار 8 ہزار قبل مسیح سے متعلق ہیں۔ اور یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مقامی تہذیب تھی۔(Jarrige 2008:135)1974 میں ژاں فرانسو جاریج (Jean Francois Jarrige) کی سربراہی میں یہاں کھدائی شروع کی گئی تو مہر گڑھ میں ایک قدیم شہر کے کھنڈرات و آثارات دریافت ہوئے۔ یہاں کے لوگوں نے اوپر تلے ساتھ بستیاں بسائی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق مہر گڑھ کی آبادی بیس سے پچیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔1974 اور 1986 پھر 1997 اور 2000ء کے درمیان یہاں متعدد بار کھدائی کی گئی۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کی کھدائی کے نتیجے میں سے یہاں سے انسانی ڈھانچے، عورتوں کی مورتیاں، کھلونے، برتن، ٹوکریاں، مختلف قسم کے اوزار، زیورات اور دوسری اشیاء دریافت ہوئیں۔ مہر گڑھ سے فیروزہ، سنگ لاجورد اور سیپیوں کے ملنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے بلوچستان اور سندھ کی ساحلوں تک رسائی سمیت افغانستان سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ کیونکہ سنگ لاجورد افغانستان میں بدخشاں کے مقام پر بکثرت ملتا ہے، دانتوں کی سب سے پہلی سرجری بھی یہاں عمل میں لائی گئی تھی۔ ماہرین کے مطابق مہر گڑھ کے لوگوں نے اسی علاقے میں پہلی بار گندم، جو اور مختلف قسم کی دالوں کی کاشت شروع کی اور 7 ہزار قبل مسیح میں مختلف قسم کے جانوروں کو پالنا شروع کیا۔

مہر گڑھ میں ریچھ، بھینس، بھیڑ بکریاں بلکہ ممکن ہے کہ ہاتھی بھی پائے جاتے تھے(Jarrige 2008:142)

جاریج کے مطابق مہر گڑھ کے ابتدائی دور میں گندم کے بیج ملے ہیں۔ ان کے خیال میں 8 ہزار قبل مسیح میں یہاں زرعی سرگرمیوں کو فروغ ملا تھا۔ (Jarrige 2008:142) اور یہاں کی بھرپور زرعی سرگرمیاں ھجری دور

(Neolithic) کے ابتدائی عرصہ میں میسوپوٹیمیا کے مشرقی سرحد سے مماثلت رکھتی ہیں اوراناج، بھیڑ اور بکریاں جنوب مغربی ایشیا سے یہاں لائے گئے تھے (Jarrige 2008:151) جبکہ گائے، بھینس اور خاص طور پر کوہان والے بیل ممکنہ طور پر مشرقی ایران اور پاکستان میں پائے جاتے تھے۔ (Franke 2015:48) ممکن ہے کہ مہر گڑھ کے لوگ مادر گیتی کی پرستش کرتے تھے کیونکہ وہاں عورتوں کی بہت سی مورتیاں دستیاب ہوئے ہیں۔ مہر گڑھ کے لوگ مردوں کو دفن کرتے تھے اور ان مدفنوں میں مردوں کے ساتھ بہت سی اشیاء بھی ملے ہیں شاید وہ حیات بعد از موت پر یقین رکھتے تھے۔ Masacarnhas کے مطابق ابتدائی توغو (Togau) مرحلہ (3800 قبل مسیح) میں مہر گڑھ کے مدفنون سے ملنے والے جسمانی ٹائپ ممکنہ طور پر مغربی ایشیاء سے تعلق رکھتے ہیں۔ (Mascarenhas etal. 2015) ماہرین کا خیال ہے کہ مہر گڑھ کے پتھر اور تانبے کے دور (Chalcolithic) کی آبادی، ھجری دور (Neolithic) سے مختلف تھی اور یہاں کی آبادی میں ایک تبدیلی آئی تھی اور بعد میں مہر گڑھ کی تہذیب وادی سندھ کی تہذیب (1300-3300ق م) کی صورت میں سامنے آیا۔ مہر گڑھ تہذیب کے علاوہ کیچ مکران میں میری قلات کے تہذیبی آثار 5 ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں (Didier and Mutin 2015:300) جبکہ کلی گل محمد کے تہذیبی آثار 5500 قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں، جسے مہر گڑھ کے دوسرے دور کا ہم عصر قرار دیا جاتا ہے۔

9.2 ژوب اور لورالائی کے تہذیبی آثار:

تہذیبی و تاریخی اعتبار سے بلوچستان کے شمالی پشتون علاقے ژوب، پشین، لورالائی اور دوسرے علاقے بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ژوب کا علاقہ قدیم عہد سے ہی ایک اہم گزر گاہ رہا ہے، جس کی سرحدیں ایک طرف صوبہ خیبر پختونخوا اور دوسرے طرف افغانستان سے متصل ہیں۔ وادی ژوب میں بہت سے ایسے ٹیلے دریافت ہوئے ہیں، جہاں قدیم انسانی بستیوں کے آثار ملتے ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق یہ بستیاں 4 ہزار سے لے کر 3 ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ آباد تھیں۔ (بلوچ 203:2012) ژوب میں پریانو غنڈئی، مغل غنڈی، بادین زئی، موسیٰ زئی اور اسماعیل زئی جبکہ لورالائی میں رانا غندائی، سور جنگل، داہر کوٹ اور چنجن کے ٹیلے قدیم انسانی بستیوں کی نمائندگی کرتے ہیں لورالائی کے مشہور ٹیلوں سور جنگل، رانا غندائی اور دابر کوٹ کو ماہرین ژوب کلچر کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ (بلوچ 208:2012)

دابر کوٹ کے تہذیبی آثار کے بارے میں ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ کم از کم 5 ہزار قبل مسیح سے متعلق ہے۔ (امجد 1989:238) اس کے علاوہ پشین میں اپیسن غنڈئی، رئیسہ غنڈئی، منز کی غنڈئی اور دیگر تہذیبی آثار قدیم انسانی بستیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

9.3 درہ بولان:

درہ بولان بذریعہ سڑک کوئٹہ سے 24 میل جنوب مشرق میں کولپور کے قریب دروازوئی سے رندلی (ڈھاڈر) تک 57 میل اور ریل کے ذریعے مشکاف تک 63 میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس درے کو تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ درہ بولان کے دامن میں جنوبی ایشیا کی قدیم ترین تہذیب مہر گڑھ واقع ہے۔ یہ عظیم تاریخی درہ ہزاروں سالوں سے سطح مرتفع ایران، مشرقی وسطیٰ اور وادی سندھ کے درمیان آنے جانے والے قافلوں، تاجروں اور حملہ آوروں کا گزرگاہ رہا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد میں سندھ اور بلوچستان کے لوگ براستہ بولان قدیم میسوپوٹیمیا کے ساتھ ربط و تعلق میں رہے تھے۔ سومیری اور اکادمی تحریروں کے مطابق 2500 قبل مسیح میں وادی سندھ سے بہت سے تجارتی سامان براستہ مکران، عراق بھیجے جاتے تھے۔ ابتدائی آریائی اقوام بھی اسی درہ سے گزر کر سندھ میں داخل ہو گئے تھے۔ (Hgues,Buller 1906:10) عام طور پر درہ بولان کو رگ وید تحریروں (7.16) کے بھلاناس (Bhalanas) قبیلے سے شناخت کیا جاتا ہے، جو سوداس بادشاہ کے خلاف دس بادشاہوں کے اتحاد یہ میں شامل تھا۔ (Witzel 1999:21) رشید اختر ندوی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ درہ بولان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کبھی بھولان، بولناس آرائی آباد تھے اور اس درہ کا نام اُن کے سردار "بولان" کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس بارے میں وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ قبیلہ خالص آریائی تھا یا نیم آریائی۔ بہر حال اسے سوداس آریائی کی سربراہی منظور نہ تھی۔ اس لیے اس نے دس بادشاہوں کے اتحاد میں شرکت کی (293:198) برطانوی دور حکومت میں جولائی 1886ء میں اس درے کے پر پیچ راستوں سے سرنگیں بنا کر پہلی بار ریلوے لائن بچھائی گئی۔ 90-1889 میں ریلوئے لائن کے خراب اور شکستہ ہونے کے باعث 1892 میں مشکاف۔ بولان پر کام کا دوبارہ آغاز کیا گیا اور 1897ء میں یہ راستہ سفر کرنے کے لیے کھول دیا گیا (Huges-Buller 1906:17) اگرچہ پورا درہ بولان قدرتی حسن کا ایک شاہکار ہے تاہم ان میں کچھ مقامات شہرت کے حامل ہیں جن میں پیر پنجہ، دوزان چشمہ، گرماپ، پیر غائب آبشار، کھجوری، بارڑی، پنجرہ پل، گوکرت اور بی بی نانی کا مزار شامل ہیں۔

9.4 میری قلات:

میری قلات تُربت کے شمال مغرب میں کیچ دریا کے دائیں کنارے پر 6 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ میری قلات یعنی "میری قلعہ" ایک قدیم تاریخی اور تہذیبی مقام ہے۔ ایک اونچے ٹیلے پر بنے ہوئے اس قلعے کے آثار و باقیات اب کھنڈر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ تاہم قلعے کی دیواروں، برجوں اور اوپری حصے کی باقیات اور آثار دیکھی جاسکتی ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے دس میٹر اونچائی تک عمارتیں ہزاروں سال پہلے رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ قلعہ کے احاطے میں تین کنوؤں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ بنانے کے لئے قلعہ کے چاروں طرف مورچے بنائے گئے تھے۔ ان مورچوں کے آثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ Besenval کے مطابق میری قلات کے تہذیبی آثار 5 ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ (Didier and Mutin 2015:300) جبکہ میری قلات سے 3 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع شاہی تمپ کے آثار 4 ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔ (بلوچ 2009:75) Besenval کے خیال میں میری قلات سے دریافت ہونے والے ظروف کا جنوب مشرقی، جنوبی اور جنوب مغربی ایران کے ساتھ مضبوط تعلق جوڑا جاسکتا ہے۔ اور یہ دور 5 ہزار سے 4 ہزار قبل مسیح کا ہے۔ مکران میں پروٹو عیلامی دور کے باہمی ربط و تعلق کے شواہد بھی ملے ہیں جو 4 ہزار قبل مسیح سے لے کر 2 ہزار قبل مسیح تک پھیلے ہوئے ہیں۔ (بلوچ 2009:58-63) میری قلات اور شاہی تمپ کے آثار اس بات کے بین ثبوت ہیں کہ خطہ مکران ماقبل تاریخی عہد میں سطح مرتفع ایران، مشرقی عرب علاقے، وسط ایشیا، مشرقی بلوچستان اور وادی سندھ کی قدیم تہذیب کے درمیان اہم رابطوں کا ذریعہ تھا۔ (بلوچ 2009:25) مکران کے قدیم آثار سے اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ ماقبل تاریخ کے ابتدائی عہد میں مہر گڑھ کی طرح یہاں کے لوگ بھی مردوں کو دفن کرتے تھے اس کے آثار ہمیں میری قلات اور شاہی تمپ سے ملے ہیں۔ تاہم بعد ازاں جب اس خطے پر وادی سندھ کی تہذیب کا غلبہ ہوا تو مردوں کو جلانے کا رواج ہو گیا۔ (بلوچ 2009:90)

9.5 شہر روغان:

لسبیلہ گوندرانی (Gondrani) کے مقام پر قدیم غار نما مکانوں پر مشتمل شہر کے آثار ملے ہیں جو Rogun شہر کے نام سے مشہور ہے۔ (Minchin 1907-39) منچن نے اسے روغن شہر لکھا ہے جبکہ موجودہ عہد میں یہ

"روغان شہر" کے نام سے معروف ہے۔ کوئٹہ سے کراچی کی جانب آر سی ڈی شاہراہ پر براستہ خضدار سفر کرتے ہوئے لسبیلہ سے لگ بھگ 30 کلو میٹر کے فاصلے پر پہلے ایک چھوٹا سا گاوں آتا ہے جسے "ماہی پیر" کہتے ہیں۔ آر سی ڈی شاہرہ سے مغرب کی جانب ایک پختہ سڑک کے اختتام پر دریائے کھڈ واقع ہے۔ عام دنوں میں یہ دریا ایک پایاب ندی کی صورت میں بہتا ہے۔ دریا کے اندر اترنے کے لیے ایک ڈھلوانی راستہ ہے جہاں سے گزر کر اس عجیب و غریب اور پُراسرار غاروں تک پہنچنے کے لیے کئی جگہوں سے پانی کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ جس مقام پر یہ اونچے کناروں والا دریا ایک تنگ درے کی شکل اختیار کرتا ہے وہیں ایک نسبتاً اونچی مگر تنگ گھاٹیوں میں" شہر روغان" واقع ہے۔ (بلوچ 157:2012) یہاں کوئی آدھے میل تک 3 سو فٹ اونچے اور 20 فٹ موٹائی کے حامل پہاڑ کے دونوں جانب کھدائی کر کے لگ بھگ 1500 گھر بنائے گئے ہیں۔ (Mimchi-1907:41)

ہر گھر کے سامنے عمومی طور پر 15 مربع فٹ کا ایک کمرہ جو برآمدہ کا کام دیتا تھا اسی برآمدہ سے گزر کر مرکزی کمرے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ جہاں مرکزی کمروں کے ساتھ دو سے تین چھوٹے کمرے ملتے ہیں۔ روشنی کے لئے کمروں کی طاقوں میں چراغ رکھنے کی جگہ کے علاوہ اناج رکھنے کے لیے مخصوص جگہیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان گھروں کی تعمیر اور بناوٹ میں فرق پایا جاتا ہے۔ کچھ گھر بڑے اور کشادہ ہیں جس میں ملحقہ کمرے بھی ملتے ہیں۔ جو شاید بڑے خاندانوں کی رہائش گائیں ہوں گی۔ جبکہ ان رہائش گاہوں کے نچلے حصے میں غریب لوگوں کی رہائش گاہیں واقع تھیں جو بناوٹ اور طرز تعمیر کے اعتبار سے بے قاعدہ اور بے ڈھب سوراخ کی طرح لگتی ہیں اور ان کے دروازے بھی بھدے انداز میں بنائے گئے ہیں۔ (Minchin 1907:39) اس تنگ درے میں بنائے جانے والی رہائش گاہوں کے بارے میں اب تک کوئی مستند اور مناسب تحقیقی کام سامنے نہ آسکا۔ اور اب یہ رہائش گاہیں موسمی اثرات اور شکست و ریخت سے دوچار ہونے کے باعث گھٹ کر 5 سو کے قریب رہ گئی ہیں۔ لسبیلہ میں ہنگلاج کے مقام پر ایک دیوی جسے مسلمان "نانی" جبکہ ہندو اسے پاربتی، کالی یا ماتا دیوی کے نام سے منسوب کرتے ہیں شاید دیوی کلدی/کالدی Nana سے متعلق ہو۔ (Minchin 1907:36) شہر روغان اور ہنگلاج مندر کے علاوہ لسبیلہ میں بہت سے دیگر مقامات بھی تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں شاہ بلاول، لاہوت لامکاں، بالا کوٹ کاٹیلہ، سسی پنوں کا مقبرہ اور ہڑت شہر کے کھنڈرات و باقیات شامل ہیں۔

9.6 ہربوئی:

ہربوئی بلوچستان کے ضلع قلات میں واقع ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ قلات میں یہ پہاڑی سلسلہ سطح سمندر سے 6500 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ سارونہ میں یہ پہاڑی سلسلہ سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ جبکہ زیندانی (Zendani) کی بلندیاں سطح سمندر سے 9424 فٹ بلند ہیں (Minchin 1907:1) ہربوئی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دو مرکب الفاظ "ہر" اور "بوئی" سے ماخوذ ہے یعنی ہر قسم کی پودوں اور جڑی بوٹیوں کی خوشبو (Micnhin 1907:3) تاہم یہ کوئی مستند بات نہیں ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کی خوبصورتی اور دلکشی کی اہم وجہ یہاں موجود صنوبر کے درخت، قدرتی چشمے، سینکڑوں اقسام کی قیمتی جڑی بوٹیاں اور مختلف قسم کے چرند پرند اور جنگلی جانور ہیں۔ زیارت کے بعد ہربوئی وہ واحد علاقہ ہے جہاں صنوبر کے وسیع جنگلات پائے جاتے ہیں۔ محکمہ جنگلات کے مطابق اگرچہ ہربوئی کے جنگلات کا سلسلہ ڈگاری تحصیل دشت ضلع مستونگ سے لے کر ضلع خضدار کی تحصیل زہری تک 2 لاکھ ایکٹر تک پھیلا ہوا ہے تاہم ضلع قلات میں درختوں کا یہ سلسلہ 55 ہزار 2 سو 30 کلومیٹر پر محیط ہے صنوبر کے ماہرین ان درختوں کو زندہ رکاز (Living Fossel) بھی قرار دیتے ہیں کیونکہ ان میں سے بہت سے صنوبر کے درخت نہایت ہی پرانے اور قدیم ہیں۔ دوسرے درختوں کی نسبت صنوبر کی نشوونما کی رفتار بہت ہی کم ہوتی ہے۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ درخت سالانہ 25 ملی میٹر کی رفتار سے نشوونما پاتے ہیں۔ صنوبر کے درختوں کے علاوہ یہاں زیتون، بادام، انجیر، بیری، گل لالہ، دھتورہ، زیرہ، بھنگرہ، عناب، جنگلی پودینہ، ہرمل، اجوائن، اسپغول، مارموت، گاؤزبان، سیاہ چوب سمیت بے شمار دیگر جڑی بوٹیاں پھول پودے اور درخت پائے جاتے ہیں۔ ہربوئی کے جنگلات میں پہاڑی بکرے، دنبے، خرگوش، چکور، عقاب، تیتر، سیہو کے علاوہ دیگر کئی اقسام کے چرند و پرند پائے جاتے ہیں۔

9.7 پیر غائب آبشار:

پیر غائب آبشار کوئٹہ سے سبی جاتے ہوئے 70 کلومیٹر کے فاصلے پر وادی بولان میں واقع ہے یہ جگہ کھجوری کے قریب واقع ہے اور آب گم ریلوے اسٹیشن سے سات میل کے فاصلے پر ہے۔ پیر غائب کا پہاڑی مقام خوبصورت آبشاروں اور چشموں سے مزین قدرتی حسن کا ایک بے مثال شاہکار ہے، یہاں پہاڑوں میں چشمے اور آبشاریں 50 سے 100 فٹ کی بلندی سے نیچے گرتی ہیں اور انتہائی خوبصورت نظارہ پیش کرتی ہیں۔ اس وادی میں پہاڑوں کے عین

درمیان سے ایک حسین آبشار دو حصوں میں تقسیم ہو کر نشیب کی طرف بہتا ہوا ایک وسیع تالاب سے جاملتا ہے جو 15 سے 20 فٹ تک گہری ہے۔ یہ خوبصورت آبشار "پیر غائب آبشار" کے نام سے مشہور ہے۔ پیر غائب کا مقام سیر و سیاحت کے لئے نہایت ہی پر کشش اور پُرفضا مقام ہے۔ جہاں کھجوروں اور شنے کے علاوہ دیگر مختلف درخت، جڑی بوٹیاں، پھول اور پودے بکثرت ملتی ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق یہ آبشار ایک بزرگ ہستی کے نام سے منسوب ہے جو برسوں پہلے اپنی بہن بی بی نانی کے ہمراہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ ان کے تبلیغ کی وجہ سے یہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو اس وقت کے آتش پرست حکمرانوں کو جب ان کے بارے میں اطلاعات ملیں تو ان کے خلاف لشکر کشی کی۔ دونوں بہن بھائی اپنی جان بچانے کی خاطر وہاں سے نکل پڑے۔ چند میل کے فاصلے پر بھائی اور بہن ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ زرتشتی لشکر پیر غائب کا تعاقب کرتی رہی۔ یہ بزرگ وادی میں اس مقام پر پہنچے جہاں سامنے بلند پہاڑی چٹان استادہ تھی اور آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا تو اس وقت پیر غائب نے اللہ سے دعا کی اور وہ چٹان میں داخل ہو کر غائب ہو گئے اس لیے یہ مقام پیر غائب کے نام سے مشہور ہے۔ Huges-Buller اسی مقامی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ خاتون (بی بی نانی) یا علی نامی شخص کی بیٹی تھی اور اس کا بھائی کھجوری گاوں سے 2 میل کے فاصلے پر ساروان میں زمین میں دھنس کر غائب ہو گیا تھا کیونکہ گبر یعنی زرتشتی پیروکاران کا پیچھا کر رہے تھے۔ پیر غائب کا چشمہ اسی کے بھائی نے اپنی کرامات کے ذریعے پیدا کیا۔ جسے مسلمان "پیر غائب" جبکہ کچھی کے ہندو اسے "مہادیو" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (Huges-Buller 1906-38) بی بی نانی کا مزار بولان سے 15 کلومیٹر کے فاصلے پر پنجرہ پل کے نیچے واقع ہے۔ بی بی نانی کو فراہمی آب کی نگران برگزیدہ ہستی قرار دیا جاتا ہے۔ (Huges-Buller 1906:37)

چارلس میسن فورمن کے مطابق ممکن ہے کہ یہ بی بی نانی قدیم ایرانی اور باختری دیوی Nania کی غمازی کرتا ہو کہ جس کی تصویر ہمیں سکوں پر دیکھنے کو ملتا ہے (Huges-Buller 1906:37-8) اس کے علاوہ ہمیں ہنگلاج میں بھی ایک بی بی نانی کا حوالہ ملتا ہے۔ Minchin کے مطابق ہنگلاج کی یہ دیوی جسے مسلمان بی بی نانی اور ہندو اسے پاربتی، کالی یا ماتا دیوی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ شاید یہ دیوی کلدی/کالدی Nana سے متعلق ہو۔ (Minchin 1907:35-6) Minchin کی یہ بات درست ہے اصل میں یہ دونوں بی بی نانی بابلی دیوی Nanna

سے متعلق ہیں جو "اروک کی خاتون" کے طور پر معروف تھی جبکہ قدیم ایرانی Nania بھی بنیادی طور پر غیر ایرانی دیوی ہے اور اسی بابلی دیوی کی عکاسی کرتی ہے۔

9.8 گوادر:

گوادر اپنی افادیت اور جداگانہ حیثیت کے باعث مکران کی تاریخ میں ہمیشہ سے ہی خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ گوادر، صوبہ بلوچستان کی جنوب مغربی ساحلی پٹی پہ خلیج فارس کے داخلی راستہ پر واقع ہے۔ جو ایک اہم تجارتی گزرگاہ ہے۔ گوادر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ علاقہ وادی کلانچ اور وادی دشت بھی کہلاتا ہے۔ پٹولمے (Ptolemy) نے اس علاقے کا ذکر Badara کے نام سے کیا ہے جو موجودہ عہد میں گوادر کے طور پر مشہور ہے (بلوچ 121:2009) 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم جب برصغیر سے واپس یونان جارہا تھا تو وہ سندھ سے ہوتا ہوا مکران میں داخل ہوا۔ یونانی مورخین نے اپنی یاداشتوں میں اس علاقے کے اہم شہروں اور دریاوں کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ گوادر دنیا کے سب سے بڑے تجارتی راستے پر واقع اور جدید ترین بندرگاہ ہونے کے باعث موجودہ عہد میں عالمی سطح پر انتہائی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ پاک، چین اقتصادی راہداری (CPEC) پاکستان اور چین کا ایک بہت بڑا تجارتی اور اقتصادی منصوبہ ہے۔ آنے والے وقتوں میں چین، افغانستان اور وسط ایشیاء کے ممالک کی بحری تجارت کا زیادہ دارومدار اسی بندرگاہ پر ہو گا۔ اس منصوبہ کے تحت جنوبی ایشیاء، مغربی اور وسطی ایشیاء کی ریاستوں کے درمیان تجارتی نقل و حمل اور گیس پائپ لائنوں کی تنصیب سمیت دیگر صنعتی اور تجارتی منصوبوں کو روبرعمل لانا ہے۔ اس کا نمایاں اور اہم مقصد جنوب مغربی پاکستان سے چین کے شمال مغربی علاقے سنکیانگ تک گوادر بندرگاہ، ریلوے اور موٹروے کے ذریعے تیل اور گیس کی کم وقت میں ترسیل کرنا ہے۔ گوادر سے کاشغر تک تقریباً 2442 کلومیٹر کا یہ طویل منصوبہ مستقبل میں چین اور پاکستان سمیت پورے خطے کے لئے نہایت ہی اہمیت کا حامل تجارتی اور اقتصادی منصوبہ ثابت ہو گا۔

9.9 ہنہ جھیل:

صوبائی دارالحکومت کوئٹہ سے شمال کی طرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع سنگلاخ چٹانوں میں 1894ء میں برطانوی سرکار نے زیر زمین پانی کی سطح بلند رکھنے اور آس پاس کے اراضی کو سیراب کرنے کے لئے ہنہ جھیل کا قیام عمل میں لایا تھا۔ کوہ زرغون سے برف باری، بارش اور اوڑک کے قدرتی چشموں کے پانی کو جھیل تک لانے کے لیے

برطانوی سرکار نے سرپل تعمیر کیا تھا اور وہاں لوہے کے پانچ دروازوں اور پانچ سرنگوں کی تعمیر کی تھی۔ تاکہ پانی کے ضیاع کو روکا جا سکے اور پانی جھیل تک پہنچ سکے۔ 1818 ایکٹر رقبے پر محیط اس جھیل میں 220 ملین گیلن پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اور اسی کی گہرائی تقریباً 49 فٹ ہے۔ بارشوں اور برف باری کا پانی مختلف گزرگاہوں سے ہوتا ہوا اوڑک سڑک پر واقع براستہ سرپل جھیل تک پہنچتا ہے۔ ہنہ جھیل کے چاروں جانب اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ان کے درمیان یہ جھیل ایک بہت بڑے دائرے کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جھیل کو بہترین سیاحتی مقام بنانے اور لوگوں کو تفریح اور ماحولیات کی بہتری کے لئے جھیل کا کنٹرول پاک فوج کے حوالے کیا گیا ہے تاکہ جھیل پر سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکے۔ ہنہ جھیل پر آنے والے سیاحوں کے لئے ہوٹل کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ یہاں بچوں کے لئے نہایت ہی عمدہ تفریحی پارک اور مختلف قسم کے جھولے اور کشتی رانی کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

9.10 ہنگول نیشنل پارک:

ہنگول نیشنل پارک بلوچستان کا سب سے بڑا نیشنل پارک ہے۔ جو چھ لاکھ اُنیس ہزار تینتالیس ہیکٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پارک بلوچستان کے تین اضلاع گوادر، لسبیلہ اور آواران کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ تاہم اس کا بیشتر حصہ لسبیلہ میں آتا ہے۔ اس پارک کا نام اس کے جنوبی حصے میں بہنے والے دریائے ہنگول کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس علاقہ کو 1988ء میں نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا، یہ پارک طبعی طور پر پہاڑ، صحرا اور دریا کے ساتھ سیلابی میدان میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں گھنے جنگلات اور جنوب میں بنجر پہاڑی سلسلہ ہے، جبکہ دوسری جانب دریائے ہنگول کے ساتھ وسیع دلدلی علاقہ ہے۔ ہنگول ندی نیشنل پارک سے ہو کر گزرتی ہے اور سمندر میں گرنے سے پہلے ایک مدوجزر والا دہانہ بناتی ہے جو آبی پرندوں اور دلدلی مگرمچھوں کا مسکن ہے۔ ہنگول نیشنل پارک معدومیت کے خطرے سے دوچار جنگلی حیات کے لئے محفوظ پناہ گاہ کا کام کرتا ہے، اس پارک کے جنگلی حیات میں پہاڑی بکرے، اڑیال، غزال، ہرن، ہندوستانی صحرائی بھیڑیے، لومڑی، گیدڑ، لگڑ بھگڑ، تیندوا، خرگوش، نایاب سمندری سبز کچھوے، مگرمچھ، چھپکلیوں کے بے شمار اقسام اور مختلف قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں۔ (بلوچ 2012:149-150) ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ پارک 280 سے زیادہ حیواناتی انواع و اقسام کا مسکن ہے۔ دریائے ہنگول کی کھاڑی میں دیگر آبی حیات کے علاوہ ڈولفن بھی پایا جاتا ہے۔ نباتات میں مختلف قسم کے درخت اور بہت سی نایاب جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

9.11 ہزار گنجی- چلتن نیشنل پارک:

کوئٹہ سے 20 کلو میٹر دور جنوب مغرب کی جانب کوہ چلتن کے دامن میں ایک وسیع و عریض علاقہ ہے۔ جسے ہزار گنجی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جنگلی حیات کی تحفظ اور بقا کے لیے 1980ء میں یہاں ایک نیشنل پارک کا قیام عمل میں لایا گیا جو ہزار گنجی، چلتن نیشنل پارک کے نام سے مشہور ہے۔ اسی پارک کا رقبہ 32500 ایکڑ ہے اور سطح سمندر سے 2021 سے 3264 میٹر بلندی پر واقع ہے۔ ابتدا میں اس پارک کے قیام کا مقصد چلتن جنگلی بکری اور مارخور کی نایاب نسل کو معدومیت سے بچانا تھا۔ 1950ء میں جن کی تعداد 1200 تھی جو 1970ء میں گھٹ کر صرف 200 رہ گئے تھے اب ان کی تعداد 800 سے تجاوز کر چکی ہے۔ مارخور کے علاوہ یہاں بھیڑیئے، لومڑیاں، دھاری دار چیتا، سلیمان مارخور، گیدڑ، لگڑ بھگڑ، جنگلی بلیاں، کچھوے، خارپشت، کوبرا اور دوسرے جانور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ہزار گنجی پارک میں انتہائی قیمتی صنوبر کے درخت اور دوسری جڑی بوٹیاں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں محکمہ جنگلات نے برسوں کی محنت کے بعد مارخور کے علاوہ دیگر جانوروں اور صنوبر کے درختوں کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ اس پارک میں ایک بہترین میوزیم بھی بنایا گیا ہے جہاں بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں پائے جانے والے مختلف جانوروں کو حنوط کر کے رکھا گیا ہے۔

خود آزمائی

1. بلوچستان کے کن تاریخی مراکز کا ذکر اس یونٹ میں کیا گیا ہے؟
2. مہر گڑھ کا تہذیبی مقام کون سے تاریخی دور سے تعلق رکھتا ہے؟
3. ژوب اور لورالائی کے ثقافتی مراکز کی اہمیت کیا ہے؟
4. درہِ بولان اور گوادر بلوچستان کی تاریخ میں کیوں اہم ہیں؟
5. قلات کے تاریخی مراکز میں کون سے آثار شامل ہیں؟
6. بلوچستان کے تاریخی اور ثقافتی مراکز کے تحفظ کی ضرورت کیوں ہے؟

حوالہ جات

1. Didier, Aurore and mutin, Benjamin 2015: The Kech-Makran region in Protohistoric Times, In: Franke ute and corteis elisa (eds) Lost and Found. Prehistoric pottery treasures from Balochistan Musem of Islamic Art, Programm Museum Kuffergraben 5,10117 Berlin
2. Franke, Ute 2015: The Beginning of a Tradition" In: Lost and found prehistoric potter treasures from Balochistan PP47-58.
3. Huges-Buller, R. 1906: Baluchistan District Gazetter series Vol iv Text. Bolan Pass and Nushki Railway District Printed at the Mercanticle Steam Press, Karachi
4. Jarrige, Jean-Francois 2008: Mehrgrah Nealithic, Pragdha No, 18:135-54 Journal of the U.P State Archaelogy Department, Lucknow.
5. Mascarenhas, DD, Raina A, Aston C.E Sagnhera DK 2015: Genetic and Cultural Deconstruction of the migration of an ancient lineage biomed Res int. 2015:2015:651415 dei
6. Michin, C.F 1907: Baluchistan District Gazetter Series, Vol Vi-B Jhalawan. Text and Appendices Bombay Education society's Press Bombey.
7. Minchin, C.F 1907 Baluchistan District Gazetter series. Vol VIII Las Bela. Text and appendices Allahbad printed at the pioneer press.
8. Witzel, Micheal 1999: Substrate languages in old Indo-Aryan (Rgvedic, Middle and Late Vedic) (EJVS) 5-1,PP 1- 67

9۔ امجد، یحیٰ 1989: تاریخ پاکستان۔ قدیم، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور

10۔ بلوچ، ڈاکٹر حمید 2009: مکران عہد قدیم سے عہد جدید تک، سید ہاشمی ریفرنس لائبریری، کراچی

11۔ بلوچ، فاروق 2012: بلوچستان کے تہذیبی نقوش، فکشن ہاوس، لاہور

12۔ ندوی، رشید اختر 1998: تاریخ ارض پاکستان، جلد اول و دوئم، سنگ میل پبلیشرز، لاہور